ماہنامہ
اگست 2022ء

طلوعِ اسلام

لاہور
اشاعت کا اناسی واں سال

قرآنی نظام
ربوبیت کا
پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ
کی خواہش پر 1938ء سے شائع
ہونے والا ماہنامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبال کا موقف:

-1 عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

-2 قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

-1 وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

-2 وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

-3 وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

اگست 2022ء

جلد 75 — شمارہ نمبر 8

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: یومِ آزادی مبارک	ادارہ	4
درسِ قرآن (حلال وحرام)	پرویز علیہ الرحمۃ	5
عورت کا مقام قرآن کی نظر میں	ڈاکٹر طاہرہ اکرم	26
جشنِ آزادی 1948ء	ادارہ	28
تبدیلی کی ابتداء	جمیل احمد عدیل	36
نظریۂ پاکستان کا مفہوم	ڈاکٹر انعام الحق	39
اسلامی نظام کے قیام سے مقاصد عالیہ حاصل ہوتے ہیں	خواجہ ازہر عباس	44
بچوں کا صفحہ: تم بہت بہادر ہو	ادارہ	54

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool) Episode No.9	56

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور — اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

یومِ آزادی مبارک

جس مسلمان کا یہ عالم ہو کہ وہ دوسری قوموں کے یومِ آزادی کی یاد کو قائم رکھنا بھی اپنے لئے فریضہ سمجھتا ہو، وہ خود اپنی آزادی کے دن کی یاد کو کس طرح بھلا سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں، وہ دن جب وہ محکومیت کے عذاب سے نجات حاصل کریں، سب سے بڑے جشن و مسرت کا دن ہوتا ہے۔ ایسا جشن جس سے دلوں میں شگفتگی، روح میں بشاشت، نگاہوں میں تازگی اور ذہنوں میں جلا پیدا ہو جائے جس سے اس قوم کے افراد کے اندر شرفِ انسانیت کا احساس بیدار ہو جائے جس سے وہ یہ کہنے میں ہزار فخر محسوس کریں کہ ہم دنیا میں کسی انسان کے سامنے نہیں جھکتے، ہماری تقدیریں ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں۔ ہم اپنے شب و روز کے آپ مالک ہیں۔ ہم اپنے حال کو اپنی مرضی کے مطابق سنوارتے ہیں، ہم اپنے مستقبل کے سانچے اپنے پیمانوں کے مطابق آپ ڈھالتے ہیں، ہم خوب و ناخوب کا فیصلہ اپنے اندازوں سے کرتے ہیں، ہم اشیائے کائنات کی اقدار اپنے معیاروں کے مطابق متعین کرتے ہیں۔ ہم اپنے فیصلوں میں کسی کی چینِ جبیں سے متاثر نہیں ہوتے۔ ہم اپنے ارادوں پر کسی کے اشارۂ ابرو کو اثر انداز نہیں ہونے دیتے۔ ہم اپنی نیند سوتے ہیں اور اپنی نیند جاگتے ہیں۔

خوش بخت ہے وہ قوم جسے یہ کچھ کہنے کی سعادت نصیب ہو جائے اور خوشتر از ہزار عید ہے وہ دن جو اس کے لئے اس آزادی کا پیغام لے کر آئے۔

سرزمینِ پاکستان کے رہنے والوں کے لئے 14 اگست کا دن، اسی جشنِ آزادی کا دن ہے۔ مبارک ہیں وہ ہمایوں بخت ساعتیں جو آج سے 75 سال پہلے ان کے لئے پیامِ حریت اور نویدِ آزادی لائیں اور مسعود و میمون ہے وہ ملت جو اس نوید حیات بخش و نشیدِ نشاط آور کی مورد و مہبط بنی۔

اگرچہ آج اگست 2022 کو مملکتِ خداداد پاکستان کی ظاہری و باطنی آزادی اور حریت کا سورج وہ تابناکیاں اپنے دامن میں نہیں رکھتا جس کی آرزو ہمارے دلوں میں 14 اگست 1947ء کو موجزن ہوئی اور آج بھی زندہ ہے۔ اسی ''آرزو'' کو زندہ رکھنے کے لئے اور اس کی تکمیل کے عہد کی تجدید کے لئے ہم اس مسعود و مبارک ساعت کی یاد میں تمام باشندگانِ پاکستان کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

درسِ قرآن

(حلال وحرام)

(سورۃ النساء آیات 160 سے 161 تک)

فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡهِمۡ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ
كَثِیۡرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا
لِلۡكٰفِرِیۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۱۶۱﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1971ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النساء کی آیت 160 سے ہو رہا ہے:(4:160)۔

پچھلے اتوار کو عید الاضحیٰ کی وجہ سے درس کا ناغہ رہا تھا اس لیے تجدید یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ سابقہ آیات میں بنی اسرائیل کے ان جرائم کا ذکر ہو رہا تھا جن کی پاداش میں' پاداش کا لفظ ہم بولتے ہیں کہ ہماری زبان میں یہی لفظ ہے' ورنہ اصل میں تو یوں کہیے کہ جس کے فطری نتائج کے طور پر' اس قوم پر ذلت اور مسکنت کی مار ماری گئی' وہ تباہی اور بربادی کے عمیق گڑھوں میں جا گری' صدیوں تک وہ دوسروں کی غلامی اور محکومی کے چنگل میں جکڑی رہی۔ ان جرائم کا ذکر ہو رہا تھا۔ اسی تسلسل میں قرآنِ کریم نے ایک اور بات کہی ہے جو آج کی اس آیت کا نقطۂ آغاز ہے۔

> ہر انسان پیدائشی طور پر آزاد ہے' پابندی صرف وہ ہے جو خدا کی کتاب نے اس پر عائد کی۔ آزادی' بلا پابندی سرکشی کہلاتی ہے جیسے سفر بلا تعین مقصد آوارگی کہلاتا ہے۔

لفظ حلال' حرام اور طیّب کا قرآنی مفہوم اور اس کے استعمال کی وضاحت:

کہا ہے کہ فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡهِمۡ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ وَبِصَدِّهِمۡ (4:160) ان کے جرائم کی وجہ سے ایک اور سزا جو ان کو ملی' وہ یہ تھی کہ حلال اور طیّب چیزوں میں سے بعض چیزیں مثلاً تمام ناخندار جانور اور گائے اور بکری کی چربی ان پر حرام قرار دی گئی تھیں۔ یہ بڑی اہم چیز ہے جو قرآنِ حکیم نے یہاں کہی ہے۔ حلال اور طیّب چیزوں کا حرام قرار دینا' جرائم کی سزا کی بنا پہ قرآنِ کریم نے کہا ہے۔ یہاں سے بڑا اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ حلال اور حرام کا اصول کیا ہے۔ زبان کے اعتبار سے حلل کے معنی ہوتا ہے ''رسیاں کھول دینا' رسیوں کے بند کھول دینا' آزاد کر دینا' پابندیاں اٹھا دینا''۔ اور اس کے برعکس دوسری چیز ہے جسے حرام کہا جاتا ہے جو ''ح ر م'' ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں

''کسی تک پہنچنے سے روک دینا' حفاظت پیدا کر دینا' پابندی عائد کر دینا' ممانعت عائد کر دینا''۔ ممانعت کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی شے کی عزت وعظمت وتحریم وتکریم کی بنا پر اس تک ہاتھ بڑھانے سے کسی کو روک دیا جائے۔ یہ جو لفظ احترام ہے' اس کا مادہ بھی وہی ''ح رم'' ہے جہاں سے لفظ حرام ہے۔ اور لفظ حرام بھی دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کعبہ کے لیے مسجد الحرام میں تو قرآنِ مجید میں آیا ہے' ابھی محرم الحرام ہمارے ہاں مہینہ آنے والا ہے۔ حرمات کے جو چار مہینے ہیں' وہ اسی میں ہیں۔ احترام کی وجہ سے کسی چیز تک نہ آنے دینا یا کوئی شے نقصان کا باعث ہے' نفرت کا موجب ہے' اس سے باز رہنا۔ تو گویا اس کی وجہ سے یہ دونوں ہوسکتی ہیں یعنی تعظیم واحترام بھی اور اس سے نفرت اور نقصان بھی۔ ان میں سے کسی وجہ سے' کسی چیز کا روک دینا' نہ پہنچنے دینا' مثلاً یہ کہ ماں یا بہن یا بیٹی سے نکاح حرام ہے' یہ جو حرمت ہے' ان کے احترام کی بنا پر ہے۔ اور یہ چیز کہ لحم خنزیر حرام ہے' یہ حرمت اس کے نقصانات کی بنا پہ ہے' نفرت کی بنا پہ ہے' احترام کی بنا پہ نہیں ہے۔ تو یہ حرام کا لفظ دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے: عربی زبان میں بھی' قرآنِ کریم میں بھی' احترام کے لیے بھی اور حرام ہونے کے لیے بھی۔ یہاں یہ چیز کہی ہے کہ حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ (4:160) وہ خوشگوار چیزیں (میں ابھی عرض کروں گا کہ حلال کے ساتھ طیّب بھی کیوں قرآنِ مجید نے کہا ہے) جو حلال تھیں ان کے بعض جرائم کی بنا پر وہ ان پر حرام قرار دی گئیں۔ کسی کو کسی شے سے روک دینا' یہ اس پر پابندی عائد کرنا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيۡۤ اٰدَمَ (17:70) ہر انسان کو محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا گیا ہے اور تکریم کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی کی غلامی اور محکومی میں نہ رہے۔

کسی انسان کو کسی انسان پر حقِ حکومت حاصل نہیں:

کسی شخص کو حق حاصل نہیں ہے کہ کسی پر از خود من مانی پابندیاں عائد کرے۔ پابندیاں عائد کرنے کا نام ہی تو غلامی ہوتا ہے۔ اس کے لیے جو قرآنِ کریم نے اصول بیان کیا ہے وہ بڑا بنیادی ہے' بڑا اہم ہے' دین کا نقطۂ ماسکہ (Focal Point) ہے۔ کہا ہے کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّىۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے' دیکھئے! کس قدر حتم ویقین یا تھدی کے ساتھ یہ آیت آئی ہے' کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ اسے قانون سازی کا اختیار حاصل ہو' خواہ اسے حقِ حکومت حاصل ہو' خواہ اسے نبوت تک بھی کیوں نہ مل چکی ہو' کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں' میرے محکوم بن جاؤ۔ کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں ہے' نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے' صاحبِ حکومت' صاحبِ کتاب ہونا تو ایک طرف رہا' جو صاحبِ نبوت ہونا ہے اس سے بھی یہ اختیار کسی کو نہیں ملتا کہ وہ کسی شخص کو اپنی غلامی' محکومی کے اندر اور پابندی کے اندر لے آئے۔ میں کہتا ہوں کہ حریت انسان کا اس سے بڑا منشور دنیا میں کہیں نہیں آیا۔ دیگر مقامات میں تو خیر پھر بھی Freedom & Independence (آزادی وحریت) کی یہ چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں مگر یہ چیز کہ

جسے نبی مانا گیا ہو، جس پر ایمان لانے سے ایک شخص مومن کہلا سکے، اس کے متعلق بھی یہ کہا جائے کہ اسے بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شخص پر از خود کوئی پابندی عائد کرے۔

پیرومرشد کی غلامی تو انسان کے دل و دماغ کے اطراف نہیں ہوتی، بیل کی طرح چھائی ہوتی ہے:

کہا ہے کہ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79)۔ عزیزانِ من! کتنی عجیب چیز ہے اور یہ آیت بڑی ہی غور طلب ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ یہ کہے کہ تم سب ربانی بن جاؤ۔ اب جو ربانی بننا ہے، قرآنِ کریم نے ایک بڑی Abstract (غیر محسوس) سی چیز کہی کہ کیسے ربانی بن جاؤ۔ ہماری خانقاہیت میں پیرومرشد کے آستانوں پر انکی بیعت سے بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں ربانی بنا رہے ہیں۔ اور اس میں جس قسم کی غلامی اور محکومی ہوتی ہے، اتنی گہری غلامی تو یہ Physical (جسمانی) غلامی بھی نہیں ہوتی، ان کا تسلط و تغلب تو انسانوں کے قلب اور دماغ پہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ یہ کہیں گے کہ تمہیں چاہیے کہ تم ربانی بن جاؤ۔

ربانی بن جانے کا طریق صرف خدا کی کتاب کی ہی پیروی ہے

سوال یہ ہے کہ آخر ربانی بننے کا ذریعہ کیا ہے؟ عزیزانِ من! یہ ہے اہم چیز۔ قرآنِ حکیم ان چیزوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا، وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ یہی وہ مقامات ہیں جہاں اس چیز کا امکان ہوسکتا ہے کہ اس کے ذرا سے غلط مفہوم سے بات کہیں سے کہیں چلی جائے۔ کہا ہے کہ تم ربانی بن جاؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ کس طرح سے ربانی بن جاؤ؟ کہا کہ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79) یہ جو خدا نے کتاب نازل کی ہے اس کتاب کی تعلیم سے، اس کتاب کی درس و تدریس سے، تم ربانی بن جاؤ۔ یعنی اب دنیا میں خدا اور انسان کے باہمی تعلق کا جو ذریعہ ہے وہ اس کی یہ کتاب ہے۔ ربانی بننے کا ایک ہی ذریعہ اس کتاب کی تعلیم و تدریس ہے، کوئی باطنی علم نہیں ہے، کوئی اور ریاضتیں نہیں ہیں، کسی قسم کے مشائخ کی بیعتیں نہیں ہیں۔ صاحب نبوت کو بھی یہ اختیار نہیں کہ کسی کو اپنی غلامی اور پابندی میں جکڑے، وہ بھی صرف تعلیم و تدریس کرنے کے لیے آتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ دنیا میں بہت بڑا آزادی کا منشور ہے۔ پابندی صرف وہ پابندی ہے جو خدا نے عائد کی ہے اور وہ جو پابندی ایسی نہیں کہ کوئی شخص اپنی طرف سے کہہ دے کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہ پابندی عائد کرو بلکہ خدا نے خود اپنی کتاب میں اس پابندی کی تصریح کر دی ہے۔ تو سمٹ کر بات یہاں آ گئی کہ ہر انسان پیدائشی طور پر آزاد ہے، پابندی صرف وہ ہے جو خدا کی کتاب نے اس پر عائد کی۔ آزادی، بلا پابندی سرکشی کہلاتی ہے جیسے سفر بلا تعینِ مقصد آوارگی کہلاتا ہے۔ اسی طرح سے اگر کسی ضابطے کی پابندی نہ ہو تو وہ آزادی نہیں ہوتی، وہ سرکشی ہوتی ہے۔ یہ وہی ہے جو آج کل ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔

خود ساختہ شریعت کی طرف سے وضع کردہ پابندی کی نوعیت اور اثرات

عزیزانِ من! پابندیاں مختلف قسم کی ہوسکتی ہیں: بیمار پہ ڈاکٹر پابندی عائد کرتا ہے کہ فلاں فلاں چیز سے پرہیز کرو، یہ تم

نے نہیں کھانی۔ یہ غلامی نہیں ہے' یہ محکومیت نہیں ہے۔ یہ پابندی اس کے حق میں منفعت بخش ہے۔ پابندی جو حکومت کے قوانین عائد کرنے ہیں کہ بائیں طرف چلنا ہے' دائیں سے نہیں جانا' وہ غلامی نہیں ہے' یہ ان کی حفاظت کے لیے ہے۔ اس قسم کی پابندی کہ برسات کے موسم میں جب ہیضے کا خطرہ ہوتا ہے تو ہیلتھ آفیسر کہہ دیتا ہے کہ امرود اور کھیرے نہیں کھانے' یہ پابندیاں آپ کی منفعت کے لیے ہیں۔ اس چیز کی پابندی کہ ہفتے میں دو دن گوشت کا ناغہ رہے گا' نہیں پکے گا' نہیں کھایا جائے گا' یہ تمدنی پابندیاں ہیں' وقتی پابندیاں ہیں' مصلحت کے تابع عائد کی جاتی ہیں لیکن اگر کسی پہ کوئی شخص یہ پابندی عائد کرے یعنی کسی ایک پر نہیں بلکہ یہ پابندی مسلمان قوم پر عائد کر دی جائے کہ فلاں چیز کا کھانا تم پر حرام ہے تو ذرا اس پابندی کی گہرائیوں اور وسعتوں پر غور کیجیے کہ اگر ایک شخص نے آج سے ہزار برس پہلے یہ بات کہی اور یہ مان لیا گیا کہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ بات کہے' جسے آپ شرعی پابندی کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چیز حرام ہے۔ وہ اپنے سامنے کے مخاطب لوگوں سے ہی نہیں کہہ رہا' کسی ایک فرد سے نہیں کہہ رہا بلکہ وہ پوری قوم سے کہہ رہا ہے اور قیامت تک کے لیے آنے والے انسانوں کے اوپر پابندی عائد کر رہا ہے۔ ارے اس سے گہری اور بڑی غلامی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کا فیصلہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے اوپر سخت زنجیروں کی طرح عائد کر دیا جائے کہ وہ اس سے رتی بھر تجاوز نہ کر سکیں' تبدیل نہ کر سکیں' اس سے ہل نہ سکیں۔ اس کے لیے پاداش اور اس سے انحراف کی سزا اس دنیا میں اس قوم کے سامنے جو بھی تجویز کریں' اور یہ کہ قیامت میں وہ جہنم میں بھی جائے۔

انسان کی آزادی اور پابندی کی حدود صرف اور صرف خدا کی کتاب متعین کرتی ہے:

ظاہر ہے کہ کسی انسان کو قرآنِ حکیم یہ حق نہیں دے سکتا۔ قرآنِ کریم نے اس باب میں اصول ہی عجیب بیان فرمایا ہے۔ عام طور پر یہودیوں کی شریعت میں بھی' ہندوؤں کے ہاں بھی' کہا یہ جاتا تھا کہ فلاں فلاں چیز تم کھا نہیں سکتے ہو یعنی عام پابندی ہوتی تھی' عام چیزیں حرام تھیں' ان میں سے فلاں فلاں چیز کی اجازت دی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے بالکل اس کے برعکس بات کہی۔ اس نے یہ کہا کہ جو کچھ بھی خدا نے پیدا کیا ہے سنو! يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لِلّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ (2:172) جو کچھ بھی خدا نے یہ سامانِ زیست پیدا کیا ہے' اسے تم کھاؤ پیؤ۔ گویا اس کا جو عام حکم ہے وہ حلال ہونے کا ہے۔ جن چیزوں پہ زندگی کا دارومدار ہے' جسے قرآنِ مجید میں سامانِ زیست کہا جاتا ہے' جسے رزق کہہ کر پکارتا ہے' وہ حلال ہیں' کھاؤ پیؤ اس پہ خدا کی سپاس گزاری کرو۔ اور یہ ہے کہ اِنۡ كُنۡتُمۡ اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ (2:172) اگر صرف اس کی غلامی کا طوق تم نے ڈالا ہے' صرف اس کے محکوم رہنا چاہتے ہو' چاہتے ہو کسی اور کی پابندی اور محکومی اور غلامی کی زنجیروں میں نہ جکڑے جاؤ' تو اس کے لیے یاد رکھو! جو کچھ سامانِ زیست پیدا کیا ہے اس کو مزے سے کھاؤ پیؤ۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ (2:173) بس یہ سمجھ لو کہ یہ چیزیں ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں۔ یعنی یہاں جو عام حکم ہے' وہ حلت کا ہے حلال ہیں' صرف یہ چیزیں ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک حرام چیزوں کی تعداد کا معاملہ اور ہمارا شب و روز کا عمل:

کہا ہے کہ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِیۡرِ وَمَاۤ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیۡرِ اللّٰہِ (2:173) حرام صرف یہ چیزیں ہیں: بہتا ہوا لہو' یہاں صرف ''دم'' (خون) کہا ہے' دوسرے مقام پہ سورۃ الانعام میں دَمًا مَّسۡفُوۡحًا (6:145) کہا ہے اور وہ ہے بہتا ہوا لہو یعنی وہ لہو جو ذبح کرنے کے بعد بھی جانور کے بعض حصوں کے اندر باقی رہ جاتا ہے تو وہ بہتا ہوا لہو نہیں ہوتا' اس لیے اس کی تخصیص کر دی گئی۔ لَحۡمَ الۡخِنۡزِیۡرِ (2:173) سور کا گوشت۔ یہ حرام ہے۔ یہ جسے آپ کھانے پینے کی طبعی چیزیں کہتے ہیں وہ یہ تین ہیں: (1) مردار' (2) بہتا ہوا لہو اور (3) خنزیر کا گوشت۔ یہی تین طبعی چیزیں ہیں جنہیں قرآنِ حکیم نے حرام قرار دیا ہے۔ ایک مقام پہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر ان کا ذکر آیا ہے اور یہی تین طبعی چیزیں ہیں۔ چوتھی چیز ایک اور بھی ہے اور اس کا تعلق عقیدے سے ہے۔ وہ ہے وَمَاۤ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیۡرِ اللّٰہِ (2:173) جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے وہ بھی حرام ہے۔ تو یہ چیزیں حرام ہو گئیں: مردار' بہتا ہوا لہو' سور کا گوشت اور ہر حلال چیز جسے خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ یہ ہیں حرام قطعی۔ یہ چار چیزیں ہیں قرآنِ کریم نے جو گنائی ہیں۔ پہلی تین چیزوں کے متعلق تو ہم میں سے ہر ایک کو علم ہے۔ مردار تو خیر کوئی کھاتا نہیں' نہ ہی وہ لہو پیتا ہے اور خنزیر کے گوشت کے متعلق تو مسلمان کے دل میں جتنی نفرت ہے' وہ ہمیں معلوم ہے۔ جس چیز کے متعلق آپ نے حتمی طور پر یہ کہنا ہو کہ آپ اس کو چھوتے نہیں آپ کہتے ہیں کہ میں تو اس کو خنزیر سمجھتا ہوں۔ کیا اس چوتھی چیز کے متعلق بھی کبھی آپ کی توجہ گئی ہے کہ قرآنِ مجید یہ کیا کہہ رہا ہے؟ یہ روز جو آپ کے ہاں گیارھویں والے کی نیازیں اور ساتویں والے کی نذریں ہوتی ہیں' یہ میر مجو کے بکرے ہوتے ہیں اور فلاں قبر کے اوپر یہ کچھ چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے' یہ کیا ہے؟ یہ ہے مَاۤ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیۡرِ اللّٰہِ (2:173) ہر حلال اور طیّب شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ عزیزانِ من! سوچیے' سور کھانے کے نام پر جن کو ابکائی آ جاتی ہے' وہ نہایت مزے سے بیٹھے ہوئے یہ سارا کچھ کھا رہے ہوتے ہیں۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ جو عام کھانا ہے اس کی تو کبھی بے حرمتی ہو جائے تو کہتے ہیں کہ خیر' کچھ مضائقہ نہیں مگر اس میں یہ قبول نہیں ہے۔

علامہ پرویزؒ کے بچپن کی گستاخی کا ایک واقعہ جو نیاز کے تبرک کی بے حرمتی کا نتیجہ اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے

ہمارے ہاں یہ مشہور ہے کہ نیاز کے دانے میں تقدیس آ جاتی ہے۔ مجھے آج تک یہ گال پر طمانچہ یاد ہے' بچپن میں یہ گستاخی ہو گئی تھی کہ ایک جگہ نیاز کا تبرک بٹ رہا تھا تو اس کے لینے کے لیے ہم نے یہ ہاتھ آگے کر دیا' حضرت صاحب نے اُدھر سے ایک طمانچہ مارا' کہا کہ ''نیاز قبول کرنے کے آداب بھی تمہیں پتہ نہیں ہیں' ایک ہاتھ میں نیاز لیتے ہو! دونوں ہاتھ کرو''۔ یہ کیا چیز تھی؟ یہ تھی مَاۤ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیۡرِ اللّٰہِ (2:173)۔ قرآن کریم نے جسے حرام قطعی قرار دیا ہوا تھا' اس کا واجب

الاحترام ہونا اتنا ہو گیا کہ اسے ایک ہاتھ میں لینا اس نیاز شریف کی اتنی بڑی گستاخی سمجھی گئی۔ یہ عجیب قوم ہے۔ دیگیں پک رہی ہیں' نیاز بٹ رہی ہے اور اس میں ایک تقدیس ساتھ شامل ہوتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے یہی چوتھی حرام قرار دی ہے۔

اضطراری حالت میں حرام چیز کے استعمال کی اجازت:

عزیزانِ من! یہی چار چیزیں ہیں قرآنِ کریم نے جنہیں حرام کہا۔ اس میں بھی آگے قرآنِ مجید کی یہ استثنا عجیب چیز ہے۔ کہتا ہے کہ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (2:173) اگر کیفیت یہ ہو جائے کہ اضطراری حالت پیدا ہو جائے' کچھ اور کھانے کو نہ ملے اور ڈر ہو کہ بھوک کی وجہ سے موت واقع ہو جائے گی۔ یہ اضطراری حالت قرآنِ مجید نے کہی ہے' اس کو خود اس نے تفصیل سے نہیں بتایا' ہر شخص اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ کونسی حد ہے جہاں پہنچ کر اضطراری حالت ہو سکتی ہے۔ اگر اضطراری حالت ہو جائے تو کہا ہے کہ یوں نہیں صاحب! ہم کھائیں گے' دیکھو کون ہمارا کیا کر لیتا ہے' ہم تو لذت کے لیے کھائیں گے' سرکشی کی بنا پہ کھائیں گے۔ کہا ہے کہ یہ کیفیت نہ ہو۔ اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو پھر اس میں اتنے حصے تک (کہ موت واقع نہ ہونے پائے) ان حرام چیزوں کی بھی اجازت دی جا سکتی ہے۔ قرآنِ کریم میں ان چیزوں کے حرام قرار دینے کے متعلق یہ اصول بیان کیا' یہ تصریح بیان کی۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ یہ ایک مقام پہ نہیں' متعدد مقامات پہ آیا ہے جہاں یہی چار چیزیں حرام ہیں اور یہی اس کے اندر استثنا ہے۔

اب یہ چیز کہ اس حلال وحرام کا اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے' غور فرمائیے کہ کس قدر' حتمی طور پر' یہ بات قرآنِ حمید نے کہی ہے کہ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰي طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ (6:145) اے رسول! ان سے کہہ دو کہ خدا نے میری طرف جو وحی کی ہے' اس وحی میں' میں ان چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو حرام نہیں پا رہا۔ آپ نے غور کیا کہ کس قدر یقین سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ وہ پوری وحی جو میری طرف کی گئی ہے' اس میں صرف یہ چار چیزیں ہیں جن کو میں حرام پا رہا ہوں' ان کے علاوہ اور کوئی شے نہیں ہے جنہیں میں حرام پا رہا ہوں۔ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (6:145) وہی چار چیزیں ہیں یعنی جو بھی میری طرف وحی ہوا ہے' اسمیں ان کے سوا کسی اور چیز کو میں حرام پا ہی نہیں رہا' یہی ہیں: مردار' بہتا ہوا لہو' لحم خنزیر اور جو شے بھی خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دی جائے۔ آگے کہا ہے کہ: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (6:145) وہی استثنا ہے کہ اگر اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو اس میں اتنی سی گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ تم ان چیزوں میں سے کسی کو اس حد تک کھا سکتے ہو۔

چار چیزوں کے علاوہ کوئی شخص بھی کسی شے کو حرام قرار نہیں دے سکتا

عزیزانِ من! یہاں یہ چیز یقین کے ساتھ کہہ دی گئی' صراحت کے ساتھ کہہ دی کہ خدا کی طرف سے جو وحی آئی ہے' اس میں یہی چیزیں حرام ہیں۔ اس کے بعد یہ بھی بتا دیا کہ خدا کے علاوہ کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شے کو کسی کے

لیے حرام قرار دیدے۔ آپ دیکھیے کہ کس تھدی سے یہ کہا گیا ہے کہ: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (7:32) اے رسول! ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو ان چیزوں کو حرام قرار دے جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے لیے حلال قرار دیا ہے' خواہ وہ زینت کی چیزیں ہوں اور خواہ کھانے پینے کی چیزیں ہوں۔ زینت و زیبائش کی چیزوں کے متعلق بھی قرآنِ کریم نے یہ کہہ دیا ہے کہ جنہیں خدا نے حرام قرار نہیں دیا' قُلْ مَنْ حَرَّمَ (7:32) کہہ دو کہ وہ کون ہے' وہ ذرا اٹھے بتائے' یہ کسے اختیار حاصل ہے کہ خدا جن چیزوں کو حلال قرار دے' وہ ان چیزوں کو حرام قرار دیدے' کسے یہ حق حاصل ہے! خواہ وہ کھانے پینے کی چیزیں ہوں یا زیب و زینت کی چیزیں ہوں' کون ہے جو انہیں حرام قرار دیتا ہے؟ ابھی یہ بات سامنے آئے گی کہ خدا کے اس چیلنج کو کون قبول کر کے دھڑلے سے کہتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ کون ہے جو ایسا کہتا ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ ہم ہیں جو ایسا کرتے ہیں۔ اس نے تو چار چیزیں کہیں جن میں تین طبعی ہیں جبکہ ہم نے وہ فہرستیں مرتب کی ہیں کہ اس کے اندر سینکڑوں شامل کر دی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مَنْ حَرَّمَ (7:32) انہیں کون حرام قرار دیتا ہے! یہ کہتے ہیں کہ ہم حرام قرار دیتے ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ صاحبِ نبوت کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ کوئی اس قسم کی پابندی انسانوں پر عائد کرے۔

حلال چیزوں میں کسی چیز کا کھانا یا نہ کھانا ہر انسان کی مرضی پر منحصر ہے:

(66:1) میں آپ دیکھیے کہ خود ذات رسالت مآب ﷺ کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (66:1) اے نبی! جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا ہے' تُو اپنے لیے بھی اسے کیوں حرام قرار دے رہا ہے۔ اس تشریح میں جانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کیا چیز تھی۔ بات تو قرآن کریم نے یہ کہی ہے کہ اور تو اور نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس نے دوسروں کے اوپر وہ پابندی نہیں عائد کی' اپنے لیے کسی چیز کے متعلق کوئی پابندی عائد کر لی کہ مثلاً میں یہ نہیں کھاؤں گا۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ چیز انسان کی اپنی مرضی پہ چھوڑی گئی ہے کہ حلال چیزوں میں کونسی چیز وہ کھائے' کونسی چیز نہ کھائے لیکن کسی چیز کو اس طرح سے ابدی طور پر اپنے اوپر حرام قرار دینا اور نبی کے اس طرح کے عمل کے نتائج بڑے دوررس ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ نبی کسی چیز کو محض اس لیے کہ طبیعت نہیں چاہتی' ناخوشگوار سمجھتی ہے' مزاج کے موافق نہیں ہے' پسند نہیں ہے' وہ اس چیز سے احتراز برتتا ہے' اجتناب برتتا ہے' نہیں کھاتا لیکن ہوسکتا ہے کہ اس کے ماننے والے اس کی امت یہ سمجھ لے کہ یہ چیز تو ہے ہی حرام۔ اور اس سے پہلے یہ واقعہ ہو چکا تھا اس لیے قرآنِ کریم کو خاص طور پر یہ چیز کہنا پڑی' خود ذات رسالت مآب ﷺ سے یہ کہا گیا کہ جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا ہے تُو اسے اپنے لیے بھی حرام قرار کیوں دے رہا ہے' تمہیں معلوم نہیں کہ اس کے نتائج کتنے دوررس ہونگے!

کسی چیز کو نہ کھانے کے سلسلہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا ایک واقعہ

جیسا میں نے ابھی عرض کیا اور پہلے بھی یہ بات ہو چکی تھی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اسی طرح سے کوئی چیز ناپسند ہوگی'

انہوں نے اسے کھانا چھوڑ دیا۔ یہودیوں نے سمجھ لیا کہ یہ چیز حرام ہے۔ کہا ہے کہ کُلُّ الطَّعَامِ کَانَ حِلًّا لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِیۡلُ عَلٰی نَفۡسِہٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىۃُ (3:93) تمام چیزیں حلال تھیں بجز اس کے کہ حضرت یعقوبؑ نے خود اپنے لیے کسی ایک چیز کو چھوڑ دیا' اُسے کھانا چھوڑ دیا تو اس کے بعد بنی اسرائیل نے سمجھ لیا کہ یہ چیز بھی حرام ہی ہوگی جو ہمارے نبی نے اسے کھانا چھوڑ دیا تھا اور اسے اپنے اوپر حرام قرار دیدیا۔ اس بنا پہ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ خواہ آپ ﷺ نے اس چیز کو اس لیے چھوڑا ہو کہ یہ طبیعت پہ کچھ ناگوار گزرتی ہے آپ ﷺ اسے کھانا نہیں چاہتے لیکن آپ ﷺ کے اس عمل کا اثر بڑا دوررس ہوگا۔ اس سے پہلے ایسا ہو چکا ہے کہ ایک نبی نے محض اپنی طبیعت کی خاطر کسی چیز سے اجتناب کیا اور اس کی امت نے اسے حرام قرار دیدیا۔ کہا ہے کہ یہ چیز نہ کرو۔

> خدا کے سوا کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ انسانوں پر اس قسم کی کوئی پابندی عائد کردے جو ابدی پابندی بن کر رہ جائے' یہ صرف خدا کو حق حاصل ہے۔ خدا نے اس کے متعلق اپنی کتاب (قرآنِ کریم) میں تصریح کردی ہے

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ حرام اور حلال کا مسئلہ' قرآنِ حکیم کی رو سے کتنا اہم ہے! وہ کہتا ہے کہ خدا کے سوا کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ انسانوں پر اس قسم کی کوئی پابندی عائد کردے جو ابدی پابندی بن کر رہ جائے' یہ صرف خدا کو حق حاصل ہے۔ خدا نے اس کے متعلق اپنی کتاب (قرآنِ کریم) میں تصریح کردی ہے کہ کون کونسی چیز ابدی حرام' ہمیشہ کے لیے حرام' ہر حالت میں حرام' قرار دیدی بجز اس کے کہ اضطراری حالت کے لیے قرآنِ حکیم نے اس کے اندر کچھ Relaxation (رعایت) کردی۔ خدا نے ان چیزوں کی تصریح اپنی کتاب (قرآنِ مجید) میں کردی۔ تو دوسری چیز یہ ہوگئی کہ کتاب اللہ کے اندر جن چیزوں کے متعلق تصریح آ گئی ہے' خدا نے صرف انہیں حرام قرار دیا ہے۔ اگلی چیز یہ کہ خود رسول اللہ ﷺ سے بھی یہ کہہ دیا گیا کہ آپ ﷺ کسی چیز کے لیے عادتاً بھی ایسا نہ کریں کہ مبادا بعد میں جو آنے والے ہیں وہ یہ سمجھ لیں کہ یہ شے بھی حرام کی فہرست میں داخل ہوجائے گی کیونکہ آپ ﷺ نے اسے نہیں کھایا۔ اور قرآنِ مجید نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ ہر جگہ یہی تین طبعی چیزیں ہیں: (1) مردار' (2) بہتا ہوا لہو' (3) لحم خنزیر اور چوتھی چیز عقیدے کی ہے کہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف جسے منسوب کیا جائے' وہ شے بھی حرام ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور چیز قرآنِ کریم کی رو سے حرام نہیں قرار دی گئی۔

حلال کے ساتھ طیّب کی شرط کا مقصد:

اب جنہیں قرآنِ کریم نے حلال قرار دیا ان کے متعلق ایسا نہیں کہ یہ ہر ایک کے اوپر فرض ہے کہ ہر حلال چیز کو ضرور کھایا جائے۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم عجیب کتاب ہے۔ عام طور پر جہاں بھی حلال کا لفظ آیا' قرآنِ حکیم نے اس کے ساتھ طَیِّبًا کا لفظ کہا ہے۔ کہا ہے کہ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ کُلُوۡا مِمَّا فِی الۡاَرۡضِ حَلٰلًا طَیِّبًا (2:168) جو کچھ بھی زمین پہ

سامانِ رزق ہے جسے حلال قرار دیا گیا ہے یعنی اس کو خدا نے حرام نہیں قرار دیا' اس کے ساتھ یہ حَلٰلًا طَيِّبًا آیا ہے۔ یہ دوسری شرط ہے کہ اس حلال میں سے جو تمہیں پسند ہو' خوشگوار ہو' مزاج کے مطابق ہو' تکلیف نہ دیتا ہو' طیّب کے اندر یہ سب چیزیں آ جاتی ہیں' انہیں کھاؤ۔ حلال میں سے بھی اب یہ تمہاری اپنی چوائس ہے' بعض چیزیں طبعاً کسی کے لیے' مزاج کے اعتبار سے' طبع کے اعتبار سے' نقصان دہ ہوتی ہیں' بعض چیزیں کسی کے ذوقِ لطیف پہ گراں گزرتی ہیں۔ وہ انہیں نہیں کھاتا' بعض چیزوں سے یونہی غیر شعوری طور پر نفرت سی ہو جاتی ہے اور بعض چیزوں کے نام سے کسی کو چڑ ہو جاتی ہے۔ آپ نے ایسے دیکھے ہونگے کہ ان کے سامنے کریلا کہیے تو وہ نیم چڑھا ہو جاتا ہے۔ کچھ چیزیں غیر شعوری طور پر بھی پیدا ہو جاتی ہیں' وہ طیّب نہیں رہتیں' حلال تو ہوتی ہیں مگر طیّب نہیں۔ اب یہ جتنی چیزیں حلال چیزوں میں سے ہیں یعنی جو قرآنِ مجید نے حرام قرار نہیں دیں' آپ دیکھیں گے کہ وہ لہو اور مردار جو ہے' وہ تو ہر ایک کے اوپر آ گیا یعنی ذبح کیا ہوا جو بکرا بھی ہے' بکرا بھی حلال ہے پھر آپ نے اس کو خدا کے نام پہ ذبح کیا وہ حلال ہوا' اس کا بھی جو بہتا لہو ہے' وہ حرام ہے۔ مردار کا تو سوال ہی نہیں ہے۔

خنزیر کے متعلق یہ چیز' جو میں نے ابھی عرض کیا ہے' چلی آ رہی ہے کہ اس کا تو نام بھی مسلمان نہیں سن سکتا لیکن اس کے علاوہ جتنی حلال چیزیں ہیں' ان حلال چیزوں میں سے آپ دیکھیے۔ ہمارے ہاں متوارث چلا آ رہا ہے (مثلاً) کتے کا نام لیجیے' ذہن میں بھی نہیں آ سکتا کہ یہ حلال ہے' اسی طرح یہ چھپکلیاں' یہ گرگٹ' یہ چوہیاں ہیں حالانکہ ہمارے ساتھ اور علاقے اور قومیں ہیں' وہ انہیں مزے لے لے کر کھاتی ہیں اور اس میں ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ جو گھن والی چیز ہے وہ یہ کھا جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی ہندو بستا ہے' آپ کس مزے سے گائے کا گوشت کھا جاتے ہیں' وہ اتنی سی چیز پر نہ صرف یہ کہ اس کی طبیعت اِبا کرتی ہے بلکہ اس پر وہاں فساد ہوتے ہیں۔ اور انہی کے ہاں کا جینی تو کسی قسم کے گوشت کی شکل نہیں دیکھ سکتا۔ نان جینی ہندوؤں کے ہاں بھی یہ ویشنو بھگت ہوتے ہیں' وہ سبزی کھاتے ہیں' گوشت کھاتے ہی نہیں ہیں۔ یہ چیز کیا ہے؟ یہ کسی قوم میں ایک عقیدے کا متوارث چلے آنا ہے کسی مسئلے کا چلے آنا ہے' اسی طرح تواتر سے کوئی روایت کسی معاشرے کے اندر چلی آتی ہے' روایت سے میرے معنی عام معاشرے کی پوزیشن ہے۔

حلال کے ساتھ طیّب ہونے کا تصور ہر جگہ مختلف ہوتا ہے اور طبعی ری ایکشن کا نتیجہ ہے

ہمارے گھروں کے اندر بچپن سے ہی ہر بچے کو معلوم ہے کہ چوہیا سے نفرت ہے' گرگٹ اور چھپکلیاں بلیاں اور کتے تو خیر کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں یہ چیزیں چلی آ رہی ہیں' یہ ہمارے لیے طیّب نہیں رہیں' طبعاً ہمارے اندر سے ان کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ یہ طیّب نہیں رہیں۔ اب اگر کوئی یہ چیز کہے کہ صاحب! ٹھیک ہے کہ آپ نے تو کہا ہے کہ یہ تین ہی طبعی چیزیں حرام ہیں' سنیے! میں نے نہیں کہا قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ یہ تین ہی طبعی چیزیں حرام ہیں' تو کیا یہ کتا

حلال ہے جی؟ اب کسی سے کہہ دیجیے کہ صاحب! کتا حلال ہے' پھر آپ دیکھیے کہ تماشہ کیا بنتا ہے کہ لو جی!''او کتا وی حلال اے'' (کتا بھی حلال ہے)۔ پھر اگلا کہتا ہے کہ صاحب! حلال ہے' اسے کہو کہ ذرا اس کو کھائے۔ انہیں وہ معلوم نہیں ہے کہ اس نے حلال کے ساتھ طیّب بھی کہا ہے۔ اب یہ حلال ہے مگر طیّب نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے ساتھ ہی کوئی قوم کوہستان میں رہتی ہو' ان کے نزدیک یہ طیّب بھی ہو۔ وہ اگر قوم مسلمان ہو تو آپ کو اس کے لیے حق حاصل نہیں ہے کہ آپ انہیں کہیں کہ آپ کتا نہیں کھا سکتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہمیں برا لگتا ہے۔ تمہیں لگتا ہوگا۔ تمہاری تو یہ بھی کیفیت ہوسکتی ہے کہ تم بینگن نہ کھاؤ۔ کیا آپ پڑوسی کو یہ کہہ دیتے ہو کہ صاحب! اپنے ہاں بینگن نہ پکائیے' ہمیں تو اس کی بو آجائے تو اُبکائی آجاتی ہے۔ آپ نے غور کیا کہ کسی چیز کے حلال ہونے میں اور طیّب ہونے میں کیا فرق ہے اور اس کے طیّب نہ ہونے میں اور حرام ہونے میں کیا فرق ہے۔ جس جس قوم میں کوئی چیز طیّب ہے اور قرآنِ کریم نے حرام قرار نہیں دیا' وہ مسلمان ہو کر بھی اس چیز کو کھا سکتی ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک وقت میں' کسی قوم پہ کوئی ایسا وقت آ کر پڑے۔ یہ گھوڑے کا' گدھے کا گوشت عام طور پر ہم نہیں کھاتے البتہ جنگ کے زمانے میں جب یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے تو وہاں اس کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔ خچریں ذبح کی جاتی ہیں' گھوڑوں کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی قوم میں ایسا وقت آجائے اور ایک نسل اس کو کھانا شروع کردے تو جو اگلی نسل ہے اس کے نزدیک یہ چیز طیّب ہو جائے گی۔ یہ طیّب و ناطیّب ہونا جو ہے' خوشگواری اور ناخوشگواری ہونا جو ہے' یہ تو انسان کا طبعی ری ایکشن ہے۔ یہاں طبعی ری ایکشن کا سوال نہیں ہے۔ آپ دیکھیے کہ قرآنِ کریم نے کتنی بڑی رعایت برتی ہے۔ حرام قطعی تو صرف یہی چیزیں قرار دی ہیں: مردار' بہتا ہوا لہو اور خنزیر۔ عقیدے کی چیز میں نے الگ بیان کی ہے یہ ہر حلال چیز ہے جس پہ خدا کے علاوہ کسی کا نام لیا گیا ہو' وہ تو آپ کہیں گے کہ یہ بار بار کیوں دہرا رہا ہے' آپ کی طبیعت میں بھی آتا ہوگا کہ صاحب! روز کھاتے ہیں' ابھی جا کر کھائی ہے' محلے میں دیگ پک رہی ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ اسے بار بار کہے جا رہا ہے' کہے جا رہا ہے لیکن وہ کیا کیا جائے یہاں قرآنِ کریم میں حرام آیا ہے۔ تین طبعی چیزیں وہ ہیں اور چوتھی یہ عقیدے کی چیز ہے جو اس نے حرام قرار دی ہے۔ یہ چیزیں جو ہیں تو یہ تو ابدی طور پر حرام ہو گئیں بجز اس کے جس میں قرآنِ حکیم نے Relaxation (رعایت) کی اضطراری حالت میں اجازت دی۔ یہ تو ابدی ہو گئیں ہر زمانے میں ہر قوم میں ہر ملک میں ہر فرد کے لیے۔ باقی چیزیں جتنی بھی ہیں وہ حرام نہیں ہیں' وہ حلال ہیں' ان میں سے جس جس کو کوئی فرد' کوئی قوم' کوئی گروہ' کوئی ملک' اپنے لیے طیّب سمجھتا ہے وہ اسے کھائے اور اگر طیّب نہیں سمجھتا تو پھر بالکل نہ کھائے۔

آنے والے دور میں حلال اور طیّب کی وسعت اور تقاضے:

عزیزانِ من! یہ ہے جو قرآن کریم نے حلت اور حرمت کے متعلق بیان کیا ہے۔ کتنی عظیم چیز ہے جو اس نے بیان کردی

ہے! اتنی کھلی ہوئی گنجائش ہے جو اس نے دیدی۔ ابھی تو ان چیزوں کے متعلق اس کی اہمیت ہمارے ذہن میں نہیں ہے کہ قرآنِ مجید نے جو اس طرح سے حلال کی رسیاں کھولی ہیں' یہ انسانیت پر کتنا بڑا احسان ہے' کل کو اس کے متعلق پتہ چلے گا۔ بہت سی ایسی چیزیں آہستہ آہستہ کم ہوتی جارہی ہیں شاید ختم ہوتی چلی جائیں کہ جو عام طور پہ کھائی جاتی ہیں' اس کے بعد انسانوں کے لیے کھانے پینے کے لیے یہ چیزیں باقی نہیں رہیں گی۔ وہ چیزیں باقی رہیں گی جنہیں آج ہم نہیں کھاتے' باقی قومیں جنہوں نے اپنے اوپر پابندیاں عائد نہیں کیں' وہ تو آسانی سے ان چیزوں کو کھائیں گی۔ یہ گدھے ہونگے' یہ گھوڑے ہونگے' یہ کتے ہونگے' یہ تمام چیزیں ہونگی۔ اگر آپ نے اپنے اوپر یہ پابندیاں عائد کیں یا خدا کی طرف سے یہ سب پابندیاں عائد ہوگئی ہوتیں تو اتنی سی چیزیں جو ختم ہوجاتیں اس کے بعد کچھ کھانے کو ہی نہیں مل سکتا تھا۔ اب آپ دیکھیے کہ یہ چیزیں اگر اضطراری حالت میں بھی کسی پر ختم ہوگئیں اور وہی کھانی پڑیں جو ہم نہیں کھاتے' اس لیے کہ وہ ہمارے نزدیک طیّب نہیں ہیں' اگر کسی مجبوری کے عالم میں بھی وہ چیزیں ہمیں کھانی پڑیں اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ان سے وہ ناگواریت اور نفرت ہے' وہ جذبہ مٹ جائے تو وہ طیّب میں آجائے گی لیکن جن قوموں نے ان چیزوں کو اپنے اوپر ابدی طور پر حرام قرار دیا ہوا ہے آپ ان کی مشکلات سوچیے۔ گوشت نہیں کھانا' ایسے مقامات میں وہ چلے جائیں جہاں سبزیاں نہیں ہوں' یہ بحر منجمد شمالی وغیرہ کے اندر جہاں برف ہی برف ہوتی ہے' صحراؤں کے اندر' سمندر میں گزارا کرنا پڑے مہینوں تک برسوں تک' کیا کیا جائے گا وہاں؟ وہاں پتہ چلے گا کہ یہ صرف دو تین چیزوں کو حرام قرار دے کر باقی کو جو حلال قرار دینا ہے یہ انسانیت کے لیے کتنی بڑی منفعت بخش چیز ہے۔

حرام وحلال کے سلسلہ میں ہمارے وضع کردہ فقروں کی نوعیت:

عزیزانِ من! یہ تو قرآنِ کریم نے کیا ہے۔ اب اس کے بعد اسے چھوڑیئے کہ آپ طبعاً کن چیزوں کو ناگوار سمجھتے ہیں۔ اب آپ اپنے ہاں کے مفتیانِ کرام سے پوچھیے۔ وہ حرام کی اتنی اتنی لمبی فہرستیں آپ کو بتائیں گے کہ آپ حیران ہوجائیں گے کہ پھر حلال کیا رہا۔ آپ کے ہاں فہرستوں کی فہرستیں مرتب ہوچکی ہیں جن میں درج ہے کہ یہ بھی حرام' یہ بھی حرام' یہ بھی حرام۔ اور پھر بعض چیزوں کے اوپر بحثیں چلی آرہی ہیں۔ آپ کے ہاں ہزار برس سے کوا حلال ہے یا حرام ہے' اس پر اتنی اتنی بڑی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ فہرستوں کی فہرستیں مرتب ہوئی ہیں۔ قرآنِ کریم نے یہ کہا تھا جو میں نے ابھی کہا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ (7:32) اے رسول! پوچھو ان سے کہ کون ہے وہ جو یہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں حرام ہیں جنہیں خدا نے حلال قرار دیا ہے۔ یہ ہیں ہمارے ہاں شریعت کے وہ ارباب جو چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر' بجا کر' کہتے ہیں کہ ہم ہیں جو ان چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ وہاں قُلْ مَنْ حَرَّمَ (7:32) میں قرآنِ حکیم نے دونوں چیزیں کہی تھیں: زینت کی چیزیں بھی اور کھانے پینے کی چیزیں بھی۔ اب ہمارے ہاں ان فہرستوں میں یہ ہے کہ ریشم پہننا حرام ہے' چاندی سونے کا زیور پہننا حرام

ہے۔اس سے ایک فائدہ تو ہوجائے گا۔ جنت میں ریشم کے کپڑے ہیں' چاندی سونے کے برتن ہیں ''اے سارے فیر اوتھے آپ حرام کھان گے'' (یہ تمام پھر وہاں حرام کھائیں گے)۔ دراصل انہوں نے یہ سب کچھ اپنے آپ پہ خود ہی حرام قرار دے لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جنت تو وہاں ہوگی جہاں یہ نہ ہوں ورنہ ''اوتھے وی جا کے رولا پادین گے'' (یہ وہاں بھی جا کر خوب گھپلا کریں گے' شور شرابا کریں گے)۔یعنی وہاں جنت میں سبزیوں کا ذکر نہیں ہے' اناج کا بھی ذکر نہیں ہے' گوشت ہی گوشت کا ذکر ہے۔ دیکھیے! قرآنِ حکیم وہاں ریشم کے مختلف قسم کے لباس کا کہتا ہے جس میں حریر واطلس بھی ہے' اس کے اندر ریشم بھی ہے' ایسے ایسے ریشمی کپڑے ہیں جو دبیز ریشم کے ہیں اور وہ باریک ریشم کے بھی ہیں۔اس قسم کی چیزیں قرآنِ مجید گنا تا چلا جا تا ہے۔اور یہ کنٹر ❶ بلوری اور چاندی اور سونے کے زیورات تو وہاں جنت میں ایک طرف رہے' وہ برتن بھی وہاں چاندی اور سونے کے گنا رہا ہے۔ جبکہ یہاں ان کا استعمال تک حرام قرار دیا جارہا ہے۔''میرا خیال ہیگا اے کہ ایناں اوتھے جا کے فتویٰ وی بدل لینا ہیگا'' (میرا خیال ہے کہ انہوں نے وہاں جا کر اپنا فتویٰ بھی بدل لینا ہے)۔میں کہہ یہ رہا تھا اور یہ بڑی اہم چیز ہے۔قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ کہو' کون ہے جس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان زینت کی چیزوں کو اور کھانے پینے کی چیزوں کو حرام قرار دیدے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کے برعکس جاری کردہ فتوے

عزیزانِ من! سوچئے تو سہی کہ ہم کہاں پہنچ گئے ہوئے ہیں۔فہرستیں مرتب ہوچکی ہیں آپ کے ہاں حرام اور حلال کی۔ اسے آپ کے ہاں فقہ کہا جا تا ہے۔قرآنِ کریم نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ ان سے کہہ دو کہ جو کچھ خدا نے وحی کیا ہے' اس میں تو میں ان چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو حرام نہیں پا تا اور خدا نے کہا تھا کہ ان سے پوچھو پھر کون ہے جو ان چیزوں کو حرام قرار دے۔ یہ اس دھڑلے سے کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں حرام قرار دی ہیں۔ یہ ''حرام قرار'' دینے کے درس کی بات شروع ہوئی تھی' یہ کہاں سے یہ چیزیں حرام قرار دی گئیں؟

خودساختہ فتوؤں کے باعث امت پر وارد ہونے والا عذاب

کہا ہے کہ: فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ (4:160)۔ان کے جرائم کی سزا میں یہ چیز کی گئی تھی کہ یہ چیزیں حرام ہیں۔ یہ جو آپ کے اوپر' امتِ مسلمہ کے اوپر' مسلمانوں کے اوپر' یہ اتنی فہرستوں کی فہرستیں ہیں جو ان چیزوں کی ہیں جو حرام قرار دیدی گئی ہیں یہ بھی تو اس امت کے جرم کی سزا میں ہی کچھ ہوسکتا ہے۔ یہ سزا ہے جو اس امت کے اوپر وارد ہوئی ہے ورنہ قرآنِ کریم نے تو تاکید کی تھی کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (5:87) اے ایمان والو! لَا تُحَرِّمُوۡا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَـكُمۡ (5:87) خدا نے جن چیزوں کو تمہارے لیے حلال طیّب قرار دیا ہے انہیں حرام نہ قرار دے لینا

❶ کنٹر۔ یہ انگریزی لفظ Deconter کا معتد ہے' واحد اور مذکر ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کتنا تاکیدی حکم ہے۔ آگے کہا ہے کہ وَلَا تَعۡتَدُوۡا (5:87) جو حد سے گزر جانے والی بات ہوگی وہ نہ کرنا۔ حدیں ہم نے مقرر کی ہیں بس یہ ہے لائن' اس سے تجاوز نہ کرنا۔ عزیزانِ من! ان چیزوں کے اندر کسی ایک چیز کا بھی جو اضافہ ہے' خدا کی جو لگائی ہوئی حد ہے' وہ اس سے تجاوز ہے۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ لَا تُحَرِّمُوۡا (5:87) جنہیں ہم نے حلال قرار دیا ہے' انہیں تم حرام نہ قرار دے لینا۔ اور اس کے بعد اس نے خود ہی بتا دیا کہ اس قسم کے لوگ بھی ہیں جو فَكُلُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ (16:114)۔ یہاں پھر وہی الفاظ آئے ہیں کہ اللہ نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے اور تم ان کو نعمت سمجھتے ہو' وہ طیّب ہیں' ان میں سے انہیں کھاؤ پیؤ اور خدا کے سپاس گزار رہو کہ اس نے خواہ مخواہ تمہارے اوپر پابندیاں نہیں عائد کر دیں۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ کہا ہے کہ یہ چیز وہی سمجھ سکے گا' وہی اس کو Appreciate (پسند) کر سکے گا جو یہ مانے کہ محکومی اور غلامی صرف خدا کی ہو سکتی ہے' کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ کہا ہے کہ اِنۡ كُنۡتُمۡ اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ (16:114)۔ قرآن کریم اس کو شرط قرار دیتا ہے کہ یہ چیز وہی سمجھ سکے گا' وہی اس کو Appreciate (پسند) کر سکے گا جو یہ مانے کہ بندوں کو' انسانوں کو' کسی کے اوپر پابندیاں عائد کرنے کا حق حاصل نہیں ہے یہ صرف خدا کو حق حاصل ہے۔ اگر تم صرف اس کی عبودیت اختیار کیے ہوئے ہو تو جو چیز ہم نے حلال قرار دی ہے' اسے حرام نہ قرار دے لینا۔ آگے کہا ہے کہ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَيۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (16:115)۔ یہ وہی الفاظ ہیں۔ پھر سن لو کہ حرام یہ چیزیں ہیں: مردار' بہتا ہوا لہو' لحم خنزیر اور خدا کے علاوہ کسی اور کے نام کے ساتھ منسوب کردہ چیزیں۔ یہ ہیں حرام۔

قرآنِ حکیم کے مقرر کردہ قوانین میں ردوبدل کرنا خدا پر افترا ہو جائے گا

آگے کہا ہے کہ وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَا تَصِفُ اَلۡسِنَتُكُمُ الۡكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ (16:116) کہتا ہے کہ یونہی بیٹھے ہوئے' زبان درازیوں سے' چکنی چپڑی باتیں کرتے کرتے' یہاں تک نہ پہنچ جاؤ کہ یہ حلال ہے یہ حرام ہے۔ وہ تو ہم نے بتا دیا کہ یہ چیزیں حرام ہیں۔ کہا ہے کہ یونہی بیٹھے ہوئے اپنی چرب زبانی کے اعتبار سے جھوٹ بولتے ہوئے' فہرستیں نہ مرتب کرنے لگ جانا۔ اور لِّتَفۡتَرُوۡا عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ (16:116) انہیں خود حرام قرار دو اور ان کو شریعتِ خداوندی بنا کر لوگوں کے اندر رائج کرو' یہ خدا کے اوپر افترا ہو جائے گا' ایسا نہ کر دینا۔ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ لَا يُفۡلِحُوۡنَ (16:116) یاد رکھو! خدا کے خلاف جو افترا بازی ہے' اس کو کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ایسا نہ کرنے لگ جانا۔ عزیزانِ من! دیکھیے تو سہی کہ اس قوم میں اس قرآنِ مجید کی تلاوت کتنی ہوتی ہے! ان کے ہاں تلاوت کے معنی صرف اس کا پڑھنا ہے حالانکہ عربی زبان میں تلاوت کے معنی "پیروی کرنا" ہوتا ہے۔ اس کی تلاوت کتنی ہوتی ہے اور ہمارا عمل اس کے خلاف کس قدر ہے! چھوٹی چھوٹی چیزیں تو ایک طرف رہیں' حلت و حرمت کے متعلق' حرام و حلال کے متعلق ہماری کیا کیفیت

ہے! جن چیزوں کو بالفاظ صریح قرآنِ حمید نے کہا تھا کہ ایسا نہ کرنا لیکن ہم نے ان چیزوں کو شریعت مقدسہ بنایا ہوا ہے۔

حرام چیزوں کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کی شریعت کا عمل دخل جو سراسر احکامِ قرآنی کے منافی ہے

ہم نے درس کی ابتدا اس آیت سے کی تھی کہ یہودیوں پر یہ چیزیں یعنی ناخن دار پرندے اور گائے اور بکری کی چربی ان کے جرائم کی وجہ سے حرام قرار دی گئی تھیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں یہ جو شریعت حقہ بیان کی جاتی ہے' اس میں بھی سارے ناخن دار پرندے حرام ہیں۔ آپ کے اربابِ شریعت کی فہرستوں کے اعتبار سے اس قسم کی چونچ جیسی طوطے کی ہوتی ہے یا جن پرندوں کے پنجوں میں ناخن ہوتے ہیں حرام ہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ یہودیوں پہ دس چیزیں ان کے جرائم کی بنا پر حرام قرار دی گئی تھیں اور ان میں بتایا یہ تھا کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ (6:146) یہ جتنے ناخن دار پرندے ہیں' یہ حرام قرار دیئے تھے جو ہم نے ان کو ان کے جرم کی بنا پر سزا دی تھی۔ آپ نے یہ سب اپنے اوپر حرام کیے ہوئے ہیں۔ انہیں تو جرائم کی سزا میں یہ چیزیں حرام ہوئی تھیں' آپ نے ازخود اپنے اوپر یہ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ یہ ہے تماشا۔ قرآنِ حکیم تصریح کر رہا ہے کہ ہم نے ان کو ان کے جرائم کی بنا پہ یہ چیز بطور سزا دی تھی لیکن ہمارے لیے اس نے حلال قرار دیا۔ ہم نے کہا کہ صاحب! ''تے ساڈے بھرا الگدے ہیگے نیں او' نال ای اوناں دے اسی وی حرام کرلیا کہ ساہنوں سزا کیوں نئیں ملدی پئی'' (ہمارے بھائی لگتے ہیں تو ہم نے ان کے ساتھ یہ حرام قرار دے لیا کہ ہمیں سزا کیوں نہیں مل رہی)۔ ہم نے ازخود اپنے اوپر ان سزاؤں کو وارد کرلیا ہے۔

بیان کردہ چار چیزوں کو حرام قرار دینے کی وجہ جواز:

اب وہ سوال باقی رہ جاتا ہے جو عام طور پہ کیا جاتا ہے کہ صاحب! قرآنِ مجید نے یہ چیزیں حرام کیوں قرار دیں۔ یاد رکھیے! بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ جن کا ''کیوں'' خود قرآنِ حکیم نے بتا دیا ہے' بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا ''کیوں'' جو ہے' وہ انسانی بصیرت' علم تجربہ مشاہدہ مطالعہ کے اوپر منحصر ہے کہ وہ ان کی بنا پر اس چیز کو پرکھے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ حرام ہیں' یعنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی کوئی وجہ ہماری سمجھ میں آئے تو حرام ہیں اور وجہ سمجھ میں نہ آئے یا ہم کہہ دیں کہ نہیں صاحب! اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے' یہ حلال ہوجائے۔ وہ تو طیّب چیز جو حلال میں سے ہے' اس میں تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں لیکن اس نے جسے حرام قرار دیا ہے' اس میں یہ صورت نہیں ہے' وہ بہر حال حرام ہے۔

''کیوں'' کی بات کو مختلف زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ڈاکٹرز' غذائیات کے متعلق جنہوں نے تحقیقات کی ہیں' وہ اپنے نقطۂ خیال سے ان چیزوں کے متعلق کچھ آپ کو بتائیں۔ سائیکولوجسٹ (ماہر نفسیات)' سوشیالوجسٹ (ماہرِ سماجیات)' انتھروپالوجسٹ (ماہر بشریات) اپنے اپنے علمی نقطۂ نگاہ سے ان چیزوں کے متعلق کچھ بیان کریں لیکن ایک چیز ایسی ہے جو سمجھ میں آتی ہے کہ یہ کیا تھی۔ پوری انسانیت کی تاریخ آپ دیکھیں۔ جب سے وہ ہمارے

سامنے آئی ہے، وہ کسی ملک کی تاریخ ہو، کسی قوم کی تاریخ ہو، اس میں آپ دیکھیں گے کہ مردار خور، خون پینے والا، خون آشام، یہ الفاظ دنیا کی ہر قوم میں، ہر ملک میں، ہر زمانے میں، تاریخ کے ہر دور میں، بڑی قابلِ نفرت قرار دی گئی ہیں یعنی ان چیزوں کے خلاف ایک عالمگیر نفرت ہے۔ کسی کو آج کہہ دیا کہ یہ خون پینے والا ہے، یہ جو خون پیتا ہے، یہ بڑا ہی قابلِ نفرت قرار پاتا ہے۔ اور جو مردار خور ہے، آپ دیکھیے سوائے ان قبائل کے جو بالکل ہی وحشت اور درندگی کے عالم میں زندگی بسر کرتے ہوں، ان میں یہ چیزیں رائج ہوتی ہیں لیکن جہاں بھی انسان ذرا تمدن اور تہذیب کے دائرے میں آیا ہے، وہاں آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیے کسی زبان کا لٹریچر اٹھا کر دیکھیے، اس کے اندر یہ چیزیں ہمیشہ نفرت کے پہلو میں بیان کی جائیں گی، محاورے ہونگے، تمثیلات ہونگی، تشبیہات ہونگی۔ باقی رہا یہ خنزیر تو اس کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ''کیوں'' حرام ہے لیکن ہمارے ہاں انسانیت کی تاریخ کسی قوم کے بارے میں پہلے صفحے ہی پر خنزیر کو ہمیشہ گالی کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ آج بھی یورپ کی یہ اقوام جو مزے لے لے کر کھاتی ہیں، وہیں ٹیبل پہ بیٹھے ہوئے اس کا گوشت کھا رہی ہیں اور گالی پھر بھی اس کو دے رہی ہیں اور منہ میں اس کا ٹکڑا بھی ہوتا ہے۔ یعنی آپ دیکھیے ان کے ہاں بھی یہ چیز گالی ہے۔ یہودیوں کے ہاں تو یہ تھا ہی حرام۔ عیسائیوں کے ہاں بھی حضرت عیسیٰؑ نے کہا ہے کہ میں تو جو شریعتِ موسوی ہے، اسی کو زندہ کرنے کے لیے آیا ہوں عیسائیوں کے ہاں بھی یہ حرام تھا۔

یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کی وجہ جواز

یہودیوں سے نفرت، دشمنی اور انتقام کی بنا پر یہ ایک عجیب المیہ ہوا تھا، یاد رکھیے! عیسائیوں کے یہودیوں کے خلاف بڑے ہی انتقام اور نفرت کے جذبات تھے اس لیے کہ یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ ہم نے عیسیٰؑ کو صلیب کیا تھا، ایک تو مریمؑ پر انہوں نے تہمتیں باندھی تھیں، حضرت عیسیٰؑ کے متعلق یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نے ان کو صلیب دے کر لعنتی کی موت مارا ہے، عیسائی تو ان کے جانی دشمن تھے۔ عیسائیوں میں ایک گروہ پیدا ہوا، جنہوں نے کہا کہ جو چیز یہودیوں کے ہاں ہوتی ہے، علی الرغم ہم اس کی مخالفت کریں گے، یہودیوں کے ہاں ختنہ کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا، انہوں نے اس کو چھوڑا۔ عیسائیوں کے ہاں شروع میں حضرت عیسیٰؑ جس مسلک کے تھے، اس میں ختنہ بھی ضروری تھا، وہی بنی اسرائیل کی جو رسم تھی اس کے اوپر وہ پابند تھے۔ اور ان کے ہاں یہ سور بھی حرام تھا، ان لوگوں نے یہ جو دو چیزیں تھیں ان دونوں کو یہودیوں کے علی الرغم ان سے انتقام کی وجہ سے اپنے ہاں جائز قرار دیا۔ یوں ان کے ہاں اس کی ابتدا ہوئی تھی اور جب کہیں سے ابتدا ہوئی تو پھر بات آگے چل نکلی، پھر وہ قوم مذہب کی بنا پر ان سے Indifferent (لاتعلق) ہوگئی ہے۔ اس لیے ان کے ہاں یہ چیزیں جائز قرار پا گئیں ورنہ ان کے لیے بھی سور حرام ہی قرار دیا گیا تھا۔ اور میں نے جیسا ابھی عرض کیا ہے کہ گوشت کھانے کی حد تک تو انہوں نے یہ جائز قرار دے لیا، گالی اب بھی سور کی دی جاتی ہے اور انجیل میں تو یہ گالی ہے ہی کہ ''موتیوں کو سوروں کے آگے تو نہ ڈال دو''

وہاں قابل نفرت انسانوں کو سور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ جو انسانیت کا عالمگیر جذبہ ان چیزوں کے خلاف چلا آ رہا تھا' میں نے کہا ہے کہ بعض چیزیں تو لوکل ہیں مثلاً ہمارے ہاں چھپکلی' مینڈک یا چوہیا وغیرہ جو ہیں' ان سے نفرت ہے' ساتھ ہی ہمارے دوسری قومیں ہیں' جن کو نفرت نہیں ہے۔ ہم گائے کا گوشت کھاتے ہیں' ساتھ ہی ہندو ہے' انہیں گائے کے گوشت سے نفرت ہے' وہ اس کی پرستش کرتے ہیں لیکن یہ سور ایسی چیز ہے جس کے متعلق عالمگیر انسانیت میں شروع سے نفرت پائی جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک عالمگیر انسانیت کے جذبات کی قدر و منزلت کا مقام:

میں یہ سمجھتا ہوں کہ قرآنِ حکیم نے عالمگیر انسانیت کے ان جذبات کا احترام کیا کہ جس کے خلاف طبع Revolt (بغاوت) کرتی ہو' اِبا کرتی ہو' اسے قرآنِ حکیم نے حرام قرار دیا۔ اور جسے آپ اقدار مشترک کہیں گے' ایسی چیزیں جو ہر جگہ' ہر زمانے میں' ہر قوم میں' مشترکاً قابل نفرت پائی جاتی ہیں یہ ان کے متعلق قرآنِ حکیم نے کہا ہے۔

باہمی رشتہ داری کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی وضاحت

میں نے کہا ہے کہ دیگر زاویوں سے جو اس کے متعلق تحقیق کریں گے وہ آپ کو اپنی اپنی نگاہ کی چیزیں بتائیں گے' یہ ان کا احاطہ ہوگا لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس طرح اس نے ماں اور بہن اور بیٹی کے رشتوں کے متعلق نکاح حرام قرار دیا ہے' انہیں اگر آپ پوچھیں تو ہوسکتا ہے کہ ہم شاید Biologically (حیاتیاتی لحاظ سے) اس کے متعلق کچھ نہ بتا سکیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض قوموں کے اندر یہ جو Cousin ہیں' یہ چچا کی لڑکی ماموں کی لڑکی' ان کے آپس کے رشتوں کو مقامی طور پر حرام قرار دیا تھا' یہ عالمگیر بات نہیں تھی۔ عالمگیر انسانیت میں آپ دیکھیں گے کہ ماں بہن بیٹی وغیرہ جو ہیں ان میں یہ نکاح حرام چلے آ رہے ہیں۔ ان کی ابتدا کیسے ہوئی' کیوں یہ ہوا' ابھی تک تو اس کی تحقیق نہیں ہوسکی۔ یہ لوگ اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں کہ ان تمام عقائد کو جو ابتدا سے انسانوں کے اندر چلے آ رہے ہیں وہ دیکھیں کہ یہ کیسے پیدا ہوئے تھے' کیا حالات تھے لیکن تاریخ میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو پوری عالمگیر انسانیت کے اندر بطور مشترک قدر کے چلی آ رہی ہیں' یہ ان چیزوں میں سے ہیں' ان میں استثنا تھا کہ جیسے یہ چیزیں جو حرام قرار دی ہیں' ایسے ہیں' ایسے قبائل اب بھی موجود ہیں جو اس قسم کی چیزیں کھا جاتے ہیں۔

بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ نکاح کے معاملہ میں رومنز اور ایرانیوں کے ہاں استثنا کا معاملہ پایا جاتا تھا

اسی طرح سے نکاح کے معاملے میں بھی ایسی استثنا پائی جاتی تھی۔ رومنز (رومیوں) کے ہاں بھی یہ کیفیت تھی کہ بیٹی سے شادی کر لیتے تھے' ایرانیوں کے ہاں بیٹیوں بہنوں سے شادی کر لیتے تھے' ان میں استثنا تھی کہ صرف Royal Family (شاہی خاندان) والے کر سکتے تھے' بادشاہ کر سکتا تھا' عوام میں یہ اجازت نہیں تھی لیکن عالمگیر انسانیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کو شروع سے ہی حرام قرار دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو رشتے حرام ہیں' یہ احترام کی وجہ سے ہیں' نفرت کی وجہ سے نہیں ہیں لیکن کسی وجہ سے بھی ہوں' یہ عالمگیر چیز تھی۔ میں نے کہا ہے کہ قرآنِ کریم نے جس چیز کو حرام قرار

دیا ہے' تحقیق کے بعد اور وجوہات بھی اس کی نکلیں گی یہ چار چیزیں ہیں جنہیں قرآن مجید نے حرام قرار دیدیا ہے' وہ بجزان حالات کے جیسے اس نے کہا ہے کہ اضطراری حالت میں اس کی اجازت ہے اور کسی صورت میں وہ جائز قرار نہیں پاسکتیں۔ جنہیں حلال قرار دیا ہے ان حلال میں سے آپ کے مزاج طبیعت اور ذوق پر منحصر ہے' جسے آپ اچھا سمجھیں' خوشگوار سمجھیں' طبع کے مطابق سمجھیں' اسے استعمال کریں' اسے کھائیں پئیں اور جسے آپ پسند نہ کریں اسے چھوڑ دیں۔

رشتوں کے معاملہ میں قرآن حکیم کا ابدی اصول:

رشتوں میں بھی یہی کیفیت ہے۔ کہا ہے کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (4:3) جن سے نکاح حلال ہے' جائز ہے' ان میں سے بھی اپنی طبیعت' انتخاب' پسند خوشگواری سے لاؤ۔ یہ انتخاب دونوں کے لیے ہے' مرد کے لیے بھی یہ چیز ہے کہ عورتوں میں سے جو طیّب ہوں ان میں سے لاؤ' عورتوں کے متعلق بھی یہ ہے لیکن آگے جا کر کہا ہے کہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (4:19) یہ قطعاً حلال نہیں ہے کہ تم عورت کی مرضی کے خلاف اس کو مجبوراً اپنے نکاح میں لے آؤ' اُس کے لیے بھی انتخاب کا حق ہے' وہاں بھی حلال کے ساتھ طیّب ہونا قرآنِ کریم نے قرار دیا ہے۔ اس لیے جو حلال ہے اس کا طیّب ہونا ضروری ہے' جو آپ کے لیے طیّب نہیں ہے' آپ اسے چھوڑ سکتے ہیں۔ جسے اس نے حرام قرار دیا ہے' اسے آپ حلال نہیں قرار دے سکتے اور جسے حلال قرار دیا ہے' ناخوشگواری کی بنا پر اسے آپ اپنے لیے چھوڑ سکتے ہیں' اسے حرام نہیں قرار دے سکتے۔ یہ ہے جو آپ کے ہاں غلط ہوا کہ اس کا حق قرآنِ حکیم نے اپنے سوا کسی اور کو نہیں دیا۔

یہودیوں کے متعلق ذکر ہو رہا تھا' یہ تاریخ میں ذلیل ترین قوم چلی آ رہی تھی۔ قرآنِ حکیم نے وہ جرائم گنائے ہیں جن کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہوگئی تھی۔ کہا ہے کہ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا (4:160) عزیزانِ من! بہت بڑا جرم یہ تھا کہ خدا کے راستے سے روکتے تھے' وہ لوگوں کو خدا سے روکنے کے لیے روک بن جاتے تھے۔

امریکا اور یورپ کے اہل دانش اور پادریوں کے استفسارات کی نوعیت اور ہماری حالتِ زار کے پیش نظر ان کا اعتراض

یہ روک بن جانا کیا چیز ہے؟ وہ کیسے روک بنتے تھے' اسے چھوڑیئے' ہم آج کیسے روک بن رہے ہیں اس کا تجربہ تو آپ کو بھی ہوتا ہوگا اور مجھے تو اکثر اسکا تجربہ ہوتا ہے۔ امریکا اور یورپ کے اکثر مفکرین' فلاسفرز' سائنٹسٹ میرے پاس آتے ہیں' وہ مجھ سے متعارف ہیں کہ اسلام کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے یہ بھی اس معاملے میں کچھ فرق رکھتا ہے۔ میں تو اسلام کو قرآنِ مجید کی روشنی میں پیش کرتا ہوں' علم و بصیرت کی رو سے اس کی تائیدات پیش کرتا ہوں۔ میں اس میں بلا استثناء عرض کروں گا اور اس میں ان کے ہاں اچھے اچھے بڑے بڑے پادری بھی شامل ہیں۔ لمبی چوڑی دنوں کی نشست نہیں ایک ہی نشست میں تھوڑے سے وقت کے اندر اس کی صداقت پہ وہ قائل ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد وہ یہ پوچھتے ہیں کہ اگر قرآنِ حمید کا دعویٰ

ہے کہ یہ انسانیت کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے تو آج ساری دنیا میں مسلمانوں کی ایسی ذلیل حالت کیوں ہے؟ اس کا کوئی جواب ہمارے سامنے نہیں ہوتا اور وہ اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ہم کس طرح خدا کے راستے میں حائل ہو رہے ہیں۔ اگر ہم آج دنیا کے سامنے نہ ہوں، ایسی ذلیل وخوار قوم، جو اپنی روٹی تک کے لیے ان کے دروازوں پر جھولیاں پھیلانے کے لیے مجبور ہے، جنہیں یہ کافر اور ملحد اور بے دین کہہ رہی ہے، اور یہ اسلام کی مدعی ہے۔ وہ ہماری حالت کو دیکھ کر اس طرف آتے ہی نہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر واقعی تمہارے ہاں یہ اس قدر شفا بخش نسخہ ہے تو تم اس قدر ان مرضوں کے اندر کیوں مبتلا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آپ کوئی ڈاکٹر بھی دیکھیں جو تپ دق کا مارا ہوا کھانستا ہے، زرد رنگ کا ہے، ہڈیاں نکل رہی ہیں اور وہ کہہ رہا ہے کہ تپ دق کے مریضو! میرے پاس آؤ، میرا نسخہ آزما کے دیکھو، چند دنوں کے اندر اندر ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ارے! نسخہ تمہارے پاس ہے تو تم خود اچھے کیوں نہیں ہو جاتے۔ یہ قرآنِ حکیم کی تعلیم، یہ اسلام کے اتنے بلند اصول، نظری طور پر اگر آپ لوگوں کو سمجھایئے تو اقوام عالم سمجھتی ہیں اور اس کے بعد وہ یہ کہتی ہیں کہ پھر تمہاری حالت ایسی کیوں ہے، اگر فی الواقعہ یہ اس قابل ہے تو تمہیں کیوں یہ شفا نہیں دیتا۔ اور پھر آج کی حالت نہیں ہے، صدیوں سے یہ کچھ ہو رہا ہے۔ اب یہ چیز کہے جانا کہ صاحب! ہم نے اسلام کو چھوڑ رکھا ہے تو اس واسطے ایسا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ جب تم خود اس کے مدعی ہو کہ اس میں اتنی منفعت بخش چیزیں ہیں تو تمہیں اپنا نفع نقصان بھی یاد نہیں آتا یعنی کونسی وجہ ہے جو تمہیں مجبور کر رہی ہے کہ اتنی منفعت بخش چیز کو چھوڑ کر، اتنی ذلت آمیز حالت تم نے اختیار کر رکھی ہے، عجیب قوم ہو تم۔ وہ اس کو باور نہیں کرتے۔ آہستہ آہستہ کیفیت ہماری بھی یہ ہو گئی ہے۔

ہماری نئی نسل میں پیدا ہونے والی مایوسی اور خدا کے حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان

عزیزانِ من! ہماری اگلی نسل میں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ ٹھیک ہے کہ کسی زمانے میں، چودہ سو سال ہوئے، تھوڑے عرصے کے لیے، اس نے حرکت پیدا کی تھی اور عربی قوم نے یہ کچھ حاصل کر لیا تھا لیکن اب یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے، اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی کہ یہ کسی قوم کو زندگی اور سرفرازی عطا کر سکے۔ خود اسلام کی طرف سے ہماری آنے والی نسل مایوس ہو رہی ہے۔ یہ ہے خدا کے راستے میں کھڑے ہو جانا، حائل ہو جانا۔ عزیزانِ من! غیروں کو دعوت دینا تو ایک طرف رہا، ہماری اپنی آئندہ نسل آگے نہیں بڑھ رہی، ہمیں دیکھ کر وہ کہتی ہے کہ آپ کی ساری تاریخ ان چیزوں سے بھری پڑی ہے۔ کیا جواب دے سکتے ہیں آپ ان کو سوائے اس کے کہ وہ جواب جو حضور سرور کائنات ﷺ نے دیا جو قرآنِ کریم نے بات **مھجورا** بیان کی ہے کہ قیامت میں جب اس قسم کی یہ ذلیل وخوار قوم آئے گی، قرآنِ مجید کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کے ماننے والے دنیا میں اعلون ہونگے اور یہ ذلتوں اور خواریوں کے پیکر جب وہاں سے آئیں گے تو یہ اس قوم کو گزرتے ہوئے، یوں قرآنِ حکیم نے ایک انداز میں بات کی ہے، رسول اللہ ﷺ خدا سے کہیں گے کہ یا اللہ! یہ ہے وہ قوم جس نے قرآنِ

حکیم کو چھوڑ دیا تھا۔ تو مصیبت یہ ہے ہماری منافقت کی کہ ہم اس کا بھی تو اعتراف نہیں کرتے کہ ہم نے قرآنِ حکیم کو چھوڑ دیا ہوا ہے۔ آج بھی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی کتاب اتنی زیادہ نہیں پڑھی جاتی' جتنا قرآنِ حمید پڑھا جاتا ہے۔ اس قرآنِ حمید کے متعلق کہیں سے ذرا بے حرمتی کی آواز آتی ہے تو کٹ مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ فلاں جگہ صاحب! قرآنِ حمید کے ورق پھاڑ دیئے' فلاں جگہ کسی نے قرآنِ کریم کی ایک سطر جلا دی' قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ اور کیفیت ہماری یہ ہے کہ اس کی صداقتوں کے راستوں میں ہم حائل ہیں۔

قرآنی حقائق کو عملی شکل دینے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارا معاشی نظام ہے:

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا (4:160) اور یہ لوگ ہمیشہ نظامِ خداوندی کی راہ میں روک بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور حائل ہونے کی سب سے بڑی وجہ جو قرآنِ کریم نے کہی ہے وہ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا (4:161) ہے۔ انہوں نے ایسا معاشی نظام قائم کر رکھا ہے کہ جس میں سرمایہ روپے کو کما کر لاتا ہے' اس میں معاوضہ محنت کا نہیں' سرمائے کا ہوتا ہے۔ ربٰو کے معنی یہ ہیں۔ ربٰو کے متعلق تو بہت دفعہ یہ چیزیں آ چکی ہیں یعنی سو روپیہ آپ کے ہاں بکس میں رکھا ہوا ہے' دس دن رکھا رہے' دس برس رکھا رہے' سو برس رکھا رہے' جب نکالو گے سو کا سو ہی ہوگا' زنگ لگ جائے تو اور بات ہے ورنہ ہوگا اتنے کا اتنا ہی۔ اس میں اس کی استطاعت نہیں ہے کہ وہ ایک سو ایک ہو جائے لیکن اسی کو اٹھا کر جب آپ کسی دوسرے شخص کو دیدیتے ہیں' اس کے بعد' سال کے بعد' وہ ایک سو دس' ایک سو بیس' ایک سو تیس' ایک سو پچاس' ہوتا چلا جاتا ہے' جس میں خود پیدا کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ ہمارا غلط نظام اس میں یہ صلاحیت دیدیتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ پیدا کر کے لائے۔ Capital (سرمائے) کے اوپر اس قسم کی جو بڑھوتی یا زیادتی ہے' وہ کسی شکل کے اندر بھی ہو' وہ ربٰو ہے۔

یہودیوں کے ہاں ربٰو کی Definition (تعریف) ہمارے ہاں کے سود کی سی ہے

یہودیوں کو اس سے منع کیا گیا تھا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ (4:161) اس سے روکا گیا تھا۔ آپ کو پتہ ہے انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے اس ربٰو کی اپنے ہاں Definition (تعریف) خود کرنی شروع کر دی بعینہٖ جو آپ نے ربٰو کی جگہ سود کا لفظ رکھا ہے۔ اب آگے سود کے متعلق بحثیں چلیں۔ آپ کو پتہ ہے بڑے زور و شور سے بحثیں چلتی ہیں کہ Commercial Interest (تجارتی سود) جائز ہے یا نہیں' یہ زرعی انٹرسٹ' کمرشل انٹرسٹ' بینک کا انٹرسٹ' انشورنس پہ انٹرسٹ' یہ بحثیں چلی ہوئی ہیں۔ اربابِ شریعت دوسری طرف بڑھے' انہوں نے کہا کہ صاحب! ٹھیک ہے' سود حرام ہے یہ مضاربت حلال ہے۔ کوئی شخص کاروبار کرتا ہے' آپ نے اس کو اپنے دو ہزار روپے دیدیئے اب وہ اس سے محنت کر رہا ہے' کام کاج کر رہا ہے' جو نفع آ رہا ہے اس نفع میں آپ کو دو ہزار کے اعتبار سے دیئے چلا جا رہا ہے' یہ حلال ہے۔ ارے! کیا یہ ربٰو نہیں ہے؟ کہ جی نہیں' کیا ہے جی؟ کہنے لگے جی! یہ تو مضاربت ہے۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے برعکس ربوٰ کا نظام:

غریب کسان آپ کے پاس آیا۔ اس نے کہا صاحب! یہ زمین کا ایک ٹکڑا ملتا ہے، مجھے آپ کسی طرح سے پانچ سو روپیہ دیدیں، میں یہ لے لوں، محنت کروں گا، اس میں فصل آئے گی، بال بچوں کا پیٹ پالوں گا آپ کا پانچ سو بھی ادا کردوں گا۔ اب اگر آپ اس سے کہتے ہیں کہ صاحب! پانچ سو کا پانچ سو کیوں، دس روپے سال کے بعد اس پہ دوں گا، پچاس روپے اس کے اوپر اور دوں گا۔ وہ کہے گا لاحول ولاقوۃ لوگ کیا کہیں گے کہ ''آ بیاج کھاندا اے جی اے'' (یہ سود کھاتا ہے جی)۔ سود حرام ہے۔ اس نے کہا کہ میاں! کہاں سردردی کرتے پھرو گے، کچہریوں میں جاؤ گے، رجسٹریاں کراؤ گے، پتہ نہیں کوئی دھوکا کرلے۔ کوئی بات نہیں! یہ زمین میں لے لیتا ہوں، تم جاؤ اس پہ کھیتی باڑی کرو، جو کچھ فصل پیدا ہوگی آدھی تمہاری، آدھی میری۔ یعنی یہ کوئی ربوٰ نہیں ہے۔ دس فیصد ربوٰ مگر یہ آدھی فصل لے آنا، کہنے لگے کہ یہ مزارعت ہے۔

دین کی جگہ مذہب نے ہمیشہ ہر سطح پر کٹ حجتی سے کام لیا ہے

یہ اُس زمانے کی بحثیں تھیں، جب یہ بنک اور انشورنس نہیں تھے، یہ ہمارے دور کی ہیں، ہم نے اس میں ایک یہ کمرشل انٹرسٹ لگایا، اس کو Sleeping Partnership (غیر کارگزار شریک) کہہ دیا۔ سوچیے تو سہی۔ انہوں (یہودیوں) نے بھی یہ کچھ کیا تھا۔ جہاں بھی دین مذہب میں آتا ہے اور یہ جو مذہبی پریسٹ ہڈ ہے، وہ اس کی اجارہ دار بنتی ہے تو وہ یہ سب کچھ کرتی ہے۔ یہ سارے آپ کے قوانین، یہ فقہیں، اس کی تشریحات آپ کے دورِ ملوکیت میں ہوئی۔ وہی آپ کے ہاں جاگیرداری کا، فیوڈل ازم کا دور، سرمایہ داری کا دور بنا۔ ان کے ہاں شریعت میں انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں صاحب! ربوٰ ہی حرام ہے، مضاربت تو حرام نہیں ہے۔ قرآنِ مجید نے کہا ہے کہ یہ تھے وہ جرائم جس کی وجہ سے اس قوم کی یہ حالت ہوئی تھی۔ کہا ہے کہ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ (4:161) یہ بغیر کسی تعمیری کام یا کام میں حصہ لیے لوگوں کا مال کھا جانا ہے۔ ان سے پوچھیے کہ یہ کرتے کیا ہیں؟ صبح کی نماز پڑھائی صاحب! نماز پڑھانے کے بعد پھر مہینے کے بعد کہتے ہیں کہ ''سٹو پیسے میرے، او کاہدے پیسے؟ نماز پڑھائی سی جی، اوتوں آپ نماز نئیں سی پڑھنی؟'' (پیسے ادا کرو میرے۔ ارے بھئی! کس چیز کے پیسے؟ جی! میں نے نماز پڑھائی تھی۔ ارے کیا تُو نے خود نماز نہیں پڑھنی تھی؟)

نماز پڑھانے کا معاوضہ:

عزیزانِ من! سوچئے یہ جو امامت کی تنخواہ ہے، وہ کس چیز کی ہوتی ہے؟ یہ ہے نماز پڑھانے کی۔ یعنی یہ کہ مسجد میں اور کسی کے لیے جگہ نہ ہو، لوگوں کو دھکے پڑ رہے ہوں، باہر سڑک پہ بارش میں دھوپ میں کھڑے ہوں، ان حضرت صاحب کے لیے سب سے آگے جگہ ہے، ان صاحب کے لیے ایک مقام متعین کیا جاتا ہے۔ یہ سب سے آخر میں آئیں سب سے آگے ان کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ وہ نماز جو انہوں نے پڑھنی تھی، جو ان کے اوپر فریضہ تھا، اس نماز کی ادائیگی کے لیے اتنی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ وہ اپنا فریضہ ادا کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ''سٹ پیسے۔ او کسے نیں او ہنوں کہیا سی نا او گرمی دے موسم اچ

دھپے کھلوتا ہو یا ہیگا ایں چھاویں ہوجا' کہن لگا کی دیں گا'' (رقم ادا کرو۔ کسی نے اسے کہا تھا کہ گرمی کے موسم میں دھوپ میں کھڑے ہو' ذرا سائے میں آ جاؤ تو وہ کہنے لگا کہ کیا دو گے)۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ: وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ (4:161)۔ عزیزانِ من! یہ باطل کا لفظ دیکھیے قرآنِ کریم میں اور لغتِ عرب میں کہ کہاں استعمال ہوتا ہے: ''بغیر تعمیری نتیجہ پیدا کیے ہوئے کوئی مال کھا جانا''۔ پریسٹ ہڈ تو ہوتی ہی یہ ہے صاحب! کوئی تعمیری کام کرتی ہی نہیں' کھائے چلے جا رہے ہیں۔ کہا ہے کہ یہ یوں کرتے تھے' ایسے کرتے تھے۔ کہا کہ ہم بھی کچھ کرتے تھے۔ ہم کیا کر رہے تھے؟ کہا ہے کہ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا (4:161) ان کے لیے دردانگیز عذاب ہے۔

ذلیل وخوار قوم کے ہاتھوں ذلیل ترین شکست

اب تو یہودیوں کی مثال بھی نہیں دی جا سکتی۔ عزیزانِ من! وہ تو ایسا دردانگیز عذاب آپ پر مسلط کر رہے ہیں کہ آپ ساٹھ ستر کروڑ کی چیخیں نکل رہی ہیں' اور عذاب ہے کہ اس قوم کے ہاتھوں دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے جنہیں آپ ہزار برس سے ذلیل ترین قوم کہہ رہے تھے' اس قوم کے ہاتھوں سے ذلت کی انتہا یہ ہے۔ خواجہ حافظ [1] کے مفہوم میں ''کسی کا غلام و نوکر بننا ہے تو اس کا تو بن جس کی دنیا میں کچھ آن ہو۔ وہ جو ہمارے ہاں مشہور ہے' وہ لاہور کا وہ پہلوان' وہ شاگرد چلا تھا پہلی کشتی لڑنے کے لیے' تو اسے اس نے کہا تھا کہ بیٹا! ایک دعا مانگنا' پہلی کشتی لڑنے جا رہے ہو'' کہن لگا جی! کی دعا منگاں' او دعا اے منگ کہ یا اللہ! اگر میں ڈھٹنا ہیگا اے تے کسے ایسے کولوں جنے پہلے وی کسے نوں ڈھایا ہووے'' (کہنے لگا جی! کیا دعا مانگوں؟ (کہا کہ) وہ یہ دعا مانگ کہ اے اللہ اگر میں نے ڈھے جانا ہے تو مجھے ایسے آدمی سے نیچا دکھانا جس نے پہلے بھی لوگوں کو نیچے دکھایا ہو)۔ یہ وہ قوم ہے جسے آپ خود ہزار برس سے ذلیل وخوار کہتے چلے آ رہے ہیں۔ جونہی آپ نے سورۃ الفاتحہ میں غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ (1:7) کہا اور آپ کے ہاں یہ لکھا ہوا ہے کہ مغضوب علیہ یہودی ہیں۔ اس قسم کی ذلیل وخوار قوم کے ہاتھوں سے جوتے پڑ رہے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا (4:161) اس سے زیادہ دردانگیز عذاب اور کونسا ہو سکتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ تھے ان کے جرائم جو قرآنِ حکیم نے گنائے تھے:

ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

ہم ہیں کہ يَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ (7:45) انسانیت کو خدا تک پہنچنے کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوئے ہیں' ہم نہ ہوتے تو یہ انسانیت واقعی خدا کے راستے کے اوپر آ گئی ہوتی۔ ہم نے یہ ربوٰ کے نظام رائج کیے ہوئے ہیں اور یہ اَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ (4:161) کے بھی۔ عذاب الیم کے اندر ہم گرفتار ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ النساء کی آیت 161 تک ہی ہم آئے' آئندہ ہم 162 ویں آیت سے لیں گے۔

[1] مسلمانوں میں خواجہ حافظ شیرازی کو ایک شاعر ہی نہیں سمجھا جاتا' انہیں بہت بڑا صوفی' ولی اللہ اور مقربِ بارگاہِ خداوندی سمجھا جاتا ہے۔ اب تو اس کا اتنا چرچا نہیں رہا لیکن جس زمانے میں علامہ اقبالؒ کی مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی تھی' دیوانِ حافظ سے لوگ فال لیتے تھے اور یہ فال انتہائی احترام اور عقیدت کے ساتھ نکالی جاتی تھی (پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992' ص:291)

ڈاکٹر طاہرہ اکرم

عورت کا مقام قرآن کی نظر میں

(کنونشن 2017ء کے موقع پر پڑھا گیا مضمون)

قرآن میں آدم یعنی آدمی کو نوع انسان کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کی رو سے زندگی کی ابتداء ایک لائف سیل (Life Cell) خلیہ حیات سے ہوتی ہے جو آگے چل کے خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک مادہ اور ایک نر پھر اُن کے امتزاج سے مردوں اور عورتوں کی بہت بڑی تعداد دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ قرآن کی رو سے مرد اور عورت میں پیدائش کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت یا سبقت حاصل نہیں۔ دونوں کا سرچشمۂ حیات ایک ہے اور دونوں ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔ قرآن کا بنیادی اصول جس پر تمام عمارت استوار ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ پیدائش کی رو سے انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں۔ پیدائش کے اعتبار سے کسی انسانی بچے میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ خدا نے جس تعظیم اور تکریم کا حامل انسان کو ٹھہرایا ہے اس میں تمام انسان شامل ہیں اور ظاہر ہے کہ انسان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ اس لئے قرآن نے جو کچھ الناس یعنی انسان کے لئے کہا ہے اس کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ نہ کوئی لڑکا اپنے اختیار اور ارادے سے لڑکا پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی لڑکی اپنے انتخاب سے لڑکی۔ اب لڑکی یعنی عورت کو لڑکا یعنی مرد سے کسی بھی اعتبار سے پست یا inferior سمجھنا پیدائشی تفریق کے اُس باطل عقیدے کی طرف لوٹ جانے کے مترادف ہے جس کو مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ قرآن کی رو سے افضلیت جوہرِ ذاتی یعنی حسنِ سیرت اور اعمال سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ پیدائش کی رو سے اور اس اُصول میں بھی مرد اور عورت دونوں شامل ہے۔ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی صلاحیتوں کو نشوونما دے کر اُن میں توازن پیدا کیا جائے۔ (جیسے میرے سے پہلے جتنے بھی مقرر تھے اُنہوں نے انتہائی خوبصورتی سے یہ بیان کیا ہے) اس سے اُس معاشرے میں توازن پیدا ہوگا۔ پھر انسان اور کائنات کی قوتوں میں توازن پیدا کیا جائے، برابر برابر مرد اور عورت دونوں کی زندگی میں۔ انسانی زندگی میں جو ناہمواریاں ہمیں نظر آ رہی ہیں اُن کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ مرد نے اپنے ہی آدھے حصہ کو پورا انسان سمجھ رکھا ہے جس سے نہ تو زندگی کا کوئی نقشہ بنتا ہے اور نہ تو اُس کو کوئی توازن نصیب ہوتا ہے اور نہ ہوگا۔ قرآن اس توازن کے لئے کیا نقشہ بتاتا ہے وہ کہتا ہے کہ تم کائنات میں غور کرو ہر جگہ تقسیمِ کار کا اُصول نظر آئے گا۔ سورج کا کام حرارت پہنچانا ہے، پانی کا کام ٹھنڈک اور نمی دینا ہے، ہوا کی اپنی الگ خصوصیات ہیں اور مٹی کی اپنی الگ لیکن بیج کی نشوونما کے لئے ان سب مختلف اور متفرق قوتوں کا امتزاج ضروری ہے اس امتزاج میں ہر قوت کا اپنا اپنا حصہ اپنا اپنا فریضہ ہے اور اس تقسیمِ کار میں کسی ایک قوت کو دوسری قوت پر فضیلت حاصل نہیں ہے اور نظامِ کائنات میں نظام کو چلانے کے لئے ہر قوت کی ضرورت ہے اور اپنا اپنا مقام، اور ان کے باہمی امتزاج یعنی ملنے سے مقصد یہ

ہے کہ جو کمی کسی ایک عنصر میں ہے اُسے دوسرا عنصر پوری کردے جو کچھ خارجی کائنات میں ہورہا ہے وہ ہی انسانی معاشرے میں مقصود ہے۔ یہاں بھی تقسیمِ کار کا اصو۔ل کارفرما ہے۔ انسانی دنیا میں دو ہی عناصر ہیں مرد اور عورت ان میں بہت سی بنیادی اور مشترک خصوصیات ہیں لیکن کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو ایک میں ہیں اور دوسرے میں نہیں ہیں۔

قانونِ کائنات کے مطابق یہاں بھی ایک کی کمی کو دوسرے کی رفاقت پورا کردیتی ہے۔ مرد اور عورت میں بیشتر خصوصیات یہ ہیں یعنی عقل اور بصیرت کا استعمال، قانونِ خداوندی کی اطاعت، اپنی استعداد کا صحیح استعمال، اپنے دعویٰ ءایمان کو سچا ثابت کرنے کی صلاحیت، ثابت قدمی، ایثار، کنٹرول، جنسی خواہشات کو مکمل پابندی میں رکھنا، قانونِ خداوندی کو ہر وقت سامنے رکھنا، یہ سب دونوں میں مشترک اور ایک جیسی ہیں اب عورت کی منفرد خصوصیات، عورت کو حیاتاتی طور پر یعنی biologically اس طرح بنایا گیا ہے کہ جس میں بچے کی تولید اور پرورش کے لئے ایسی خصوصیات رکھ دی گئی ہیں کہ جس سے مرد محروم ہے۔ عورت کی یہ خصوصیات معاشرے کی بنیادی ضرورت اور مرد کی ایک بہت بڑی کمی کو پورا کرتی ہیں اس اعتبار سے عورت کا درجہ مرد سے فائق ہے۔ بچہ کی تربیت ماں کی گود میں ہوتی ہے جس قسم کی اُس کی تربیت ہوگی اُسی قسم کا وہ بچہ بنے گا اور جس قسم کے قوم کے بچے ہوں گے اُسی قسم کی وہ قوم ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان اور خود قرآن مجید میں قوم کے لئے اُمت کا لفظ آیا ہے اور لفظ اُمت کا مادہ اُم ہے جس کے معنی ہے ماں لہٰذا قرآنِ کریم کی رو سے اُمت / قوم کی تخلیق اور تشکیل کی ذمہ داریاں ماں کی ہیں۔ ذرا سوچو کہ اس اعتبار سے عورت کتنی بڑی ذمہ داریوں کی حامل اور کتنے عظیم مقام کی مالک ہے لیکن جب عورت اس عظیم کام یعنی تولید اور تشکیلِ اُمت میں مصروف ہے تو مرد اکتسابِ رزق کررہا ہے اور اُس کی دوسری کمی یعنی احتسابِ رزق کو پورا کررہا ہے۔ اب چونکہ مرد کماتا ہے تو یہ کمائی عورتوں پر اُس وقت تک صرف ہوتی ہے جب تک اُن کے حالات اُنہیں اکتسابِ رزق کرنے کی اجازت نہ دیں تو مرد یہ سمجھ لیتا ہے کہ اُس کو عورت پر فضیلت حاصل ہوگئی اور یہ سوچ معاشرے کی ناہمواری کی وجہ ہے۔ اور اس خود ساختہ معیارِ فضیلت کو اس حد تک کھینچ لیا گیا ہے کہ عورت کے دل میں رہ رہ کر سوال اُٹھتا ہے کہ میں عورت کیوں بن گئی مرد کیوں نہ بنی۔ حالانکہ سوچ اور خیال یہ ہونی چاہئے کہ دونوں مرد اور عورت یہ آرزو شدت سے کیا کریں کہ جو بھی اُن کا میدانِ عمل ہے خدا اُسے پورا کرنے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت اور توفیق دے۔ بدقسمتی سے قرآن کی صحیح تعلیم کو نہ پھیلانے سے خاص طور پر مسلم اُمہ آج کل جس اخلاقی اور ذہنی پستی کا شکار ہے اُس کا حل عورت کی قرآنی اور دنیاوی تعلیم میں ہے اور اُسے اُس کا وہ مقام دینے میں ہے جو قرآن نے اُس کو دیا تھا یعنی اُمت کی ماں۔ اُمت کی بہتری اس صورت میں ممکن ہے کہ جب مائیں قرآنی اور دنیاوی تعلیم دونوں میں باصلاحیت ہوں گی۔ عورتوں کو جاہل رکھ کر اُن پر ذہنی اور جسمانی تشدد کر کے بدقسمت قوم اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑا مار رہی ہے۔

میری بہنو اور بیٹیو! آؤ ہم سب مل کر اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی مدد کریں اور خاص طور پر یہ عہد کریں کہ ہم سب آپس میں بہنیں اور ہم مقصد بن کر رہیں گی کیونکہ ہم سب ایک ہی مٹی سے بنی ہیں۔ اللہ نے اس دنیا میں ہر ایک کے لئے رزق بھیجا ہے آؤ ہم سب اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس اکتسابِ رزق میں اپنی اُن بہنوں اور بیٹیوں کی مدد کریں جو نامناسب حالات کا شکار ہیں اور اُنہیں اُن کے پاؤں پر کھڑا کریں اور آنے والی نسلوں کا مستقبل سنواریں۔ آمین شکریہ

ادارہ

یہ آج سے چوہتر سال قبل کی بات ہے!

جشنِ آزادی 1948ء

تشکیلِ پاکستان کے بعد' طلوعِ اسلام نے یہ معمول بنالیا تھا کہ وہ ہرسال' جشنِ آزادی (14 اگست) کی تقریب پر' ایک خصوصی مقالہ میں' ملی جائزہ لیا کرتا تھا اور اس احتساب خویش سے' قوم کو بتایا کرتا تھا کہ ہم نے اس ایک سال میں کیا کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں اس نے' جشنِ آزادی (1948ء) کی تقریب پر جو جائزہ لیا تھا' اسے آئندہ صفحات میں بجنسہٖ پیش کیا جاتا ہے' اس مقصد کے ساتھ کہ ہم اس آئینے میں اپنے خط و خال دیکھیں اور اس امر کا جائزہ لیں کہ آج ٹھیک چوہتر سال بعد ہماری حالت کیا ہے۔

اس جائزہ کا آغاز

نذرِ عقیدت

سے کیا گیا تھا جو درج ذیل ہے۔

''بیسویں صدی کے آغاز سے 1930ء تک' مسلمانانِ ہند کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں ادھر سے ادھر اڑا لے جاتا۔ پانی کی رو آتی اور انہیں اپنے ساتھ بہالے جاتی۔ قوم نہیں ایک ناقہ تھی بے زمام' ایک کارواں تھا بے منزل و بے سالار' ان کی سعی وعمل بگولے کے رقص اور سمندر کی لہروں سے زیادہ نتیجہ خیز نہ تھی کہ اس محشرستانِ تشتت و انتشار میں اللہ کا ایک بندہ اٹھا جسے مبداءِ فیض کی کرم گستری نے دانشِ برہانی کے ساتھ دانشِ نورانی'' کی طرح متاعِ گراں بہا سے بھی سرفراز کیا تھا۔ اس نے قافلے کے منتشر افراد کو للکارا اور کہا کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ قرآن نے تمہاری منزل کونسی مقرر کی ہے اور ہندوستان کے احوال وظروف کے پیشِ نظر اس منزل تک پہنچنے کے لئے کون سی راہ سیدھی ہے۔ اس نے گردوپیش کے حالات کا تجزیہ کیا اور الہ آباد کے مقام پر کھلے اور واضح الفاظ میں بتادیا کہ

شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ (خطبۂ صدارت 1930ء۔ علامہ اقبالؒ)

پھر اس کی نگہٗ دوررس ایک ایسے صاحبِ فراست و اخلاص کی متلاشی ہوئی جو ملتِ اسلامیہ کی اس متاعِ بُردہ کی بازیافت کے لئے مقدمہ لڑے اور قوم کو راہ میں فروخت ہی نہ کر دے۔ 1937ء میں اس نے یہ دستاویز ایک ایسے آزمودہ کار، صاحبِ دیانت و اخلاص وکیل کے ہاتھوں میں دے دی جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ دنیا نے اسے محمد علی جناح اور ملت نے قائداعظم کہہ کر پکارا۔ (علیہ الرحمتہ)۔

اس نحیف و ناتواں رہبر نے جس تدبر و فراست اور اخلاص و دیانت سے اس مقدمہ کو لڑا، دنیا کی عدالتیں اس پر متعجب و حیران ہیں۔ اللہ نے اس کے حسن نیت کو متاعِ کامرانی سے نوازا اور اگست 1947ء میں وہ قوم کے حق میں ڈگری لے کر احاطۂ عدالت سے باہر آیا۔

ملتِ اسلامیہ اس مفکرِ اعظمؒ اور اس قائداعظمؒ کی بارگاہِ عالیہ میں حسنِ عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے کا فخر حاصل کرتی ہے۔''

☆☆☆

اس کے بعد احتسابِ خویش پر مشتمل جائزہ ملاحظہ فرمائیے۔

جشنِ آزادی 1948ء

آزادی کی دیوی: ''انسانی تاریخ کے اوراق پیچھے کو الٹتے جائیے۔ کاغذ سے دھاتوں اور دھاتوں سے پتھروں، محلات سے جھونپڑیوں اور جھونپڑیوں سے غاروں تک کے ازمنۂ مظلمہ میں پہنچ جائیے۔ اس کی تہذیب کے نقشے بدلتے اور اس کے تمدن کے خاکے مختلف ہوتے چلے جائیں گے۔ زبانیں بدلیں گی، خیالات بدلیں گے، طرزِ بود و ماند بدلے گا، اسلوبِ رفتار و گفتار بدلے گا، لیکن اعصار و دہور کے اس تضاد و تبائن اور امصار و دیار کے اس اختلاف و تنوع میں ایک شے ہر جگہ اور ہر مقام پر مشترک اور غیر متبدل نظر آئے گی اور وہ یہ کہ انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ آزادی کی حمد و ستائش میں لاہوتی نغمے گائے ہیں۔ اس نے مختلف زمانوں میں مختلف خداؤں کو چھوڑا اور مختلف دیوتاؤں کو پوجا ہے لیکن اس نے آکاش کی اس دیوی کے حضور، بلاتخصیص زمان و مکاں ہمیشہ شردھا کے پھول چڑھائے اور عقیدت کی شمعیں جلائی ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں آپ کو خدا تک کے منکرین مل جائیں گے لیکن کسی ایک دور میں بھی ایسا گروہ نہیں ملے گا جس نے آزادی کی عظمت سے انکار کیا ہو۔ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اپنی اپنی آزادی کے تحفظ کی جدوجہد کی مسلسل داستان۔ مختلف ادوار میں نماریدو فراعنۂ زماں اور اکاسرہ و قیاصرۂ دہر، ہمیشہ

> سال بھر میں ایک مرتبہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ اس آزادی نے ہم میں کونسی تبدیلی پیدا کی کہ جس کے باعث ہم اس آزادی کی زندگی کو سابقہ غلامی کی زندگی پر ترجیح دیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اس بظاہر آئینی آزادی میں کسی ایسی شے کی کمی ہے جس سے آزادی اور غلامی میں چنداں امتیاز نظر نہیں آتا

اس کوشش میں رہے کہ کمزور انسانوں کے سینہ سے آزادی کی تمنا کو مٹا دیا جائے لیکن کمزور و ناتواں انسانوں نے اپنا سب کچھ لٹنا اور مٹنا گوارا کر لیا مگر آزادی کی حسین آرزؤں کو اپنے دل کے کاشانوں سے کبھی مٹنے نہیں دیا۔ اس نے اس قربان گاہ پر اپنی عزیز ترین متاعِ حیات تک بھینٹ چڑھا دی لیکن اس کی آن پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ تاریخ کے ریگ ساحل پر اَن گنت موجیں آئیں اور مختلف نقوش کو بہا کر ساتھ لے گئیں۔ لیکن اگر کوئی نقش ایسا تھا جو اس کی مسلسل تگ و تاز کے باوجود کبھی نہ مٹ سکا تو وہ اس بطلِ جلیل کے نام کا نقش تھا جس نے آزادی کے تحفظ کی خاطر جان دے دی یا پھر اس باعثِ ننگ انسانیت کا نام جس نے اپنوں کی آزادی کو دوسروں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ بہر حال دنیا نے ہر قوم کی عظمت کو آزادی کے پیمانے سے ناپا اور اسی کے معیاروں سے جانچا ہے بایں غط کہ آزادی دنیا کے ہر لغت میں شرف و مجد انسانیت کے مرادف اور غلامی' ذلت و خواری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی بالآخر ہے کیا' جو انسان کے لئے اس درجہ مرغوب و مقصود بن چکی ہے۔ اگر وہ یہی آزادی ہے جس کا غلغلہ ہم بھی ایک سال سے سن رہے ہیں تو ہمیں حیرت ہے کہ انسان کو کیا ہو گیا کہ اس نے اس کی خاطر زمین اور آسمان کو ایک کر رکھا ہے۔

ہماری آزادی:

ہم گزشتہ ایک سال سے آزاد ہیں۔ پچھلے سال بھی 15 اگست کو ہم نے آزادی کا جشن منایا۔ آج امسال پھر ویسا ہی جشنِ آزادی منا رہے ہیں۔ آزادی کا یہ تہوار اب ہر سال منایا جایا کرے گا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے اس ظاہری شور و غوغا اور سطحی دھوم دھام کے ہماری حیاتِ اجتماعیہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ ہم وہی کچھ ہیں جو 15 اگست 1947ء سے پہلے تھے۔ ہم وہیں ہیں جہاں اس تاریخ آزادی کے وقت تھے۔ بلکہ ایک لحاظ سے اس سے بھی کچھ پیچھے۔ ہم اب آزاد ہیں۔ قانونی اور آئینی معنوں میں پوری طرح آزاد۔ لیکن کیا آزادی کے نتائج یہی کچھ ہوتے ہیں جن سے ہم دوچار ہیں؟ کیا یہی وہ آزادی ہے جس کے نغمے فطرتِ انسانی کے ساز سے ہمیشہ ابھرتے' ابلتے رہتے ہیں؟ کیا ہم خود اسی آزادی کا مطالبہ کیا کرتے تھے؟ اگر آزادی اسی کیفیت (بلکہ عدم کیفیت) کا نام ہے تو ہمیں اعتراف کر لینا چاہئے کہ تاریخ کی رصدگاہوں کے تمام نقوش باطل ہیں' یا ہم ہی نے کہیں دھوکا کھایا ہے۔

کہنے کو ہم آزاد ہیں۔ ہر معنی میں آزاد۔ لیکن ہمیں سال بھر میں ایک مرتبہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ اس آزادی نے ہم میں کونسی تبدیلی پیدا کی کہ جس کے باعث ہم اس آزادی کی زندگی کو سابقہ غلامی کی زندگی پر ترجیح دیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اس بظاہر آئینی آزادی میں کسی ایسی شے کی کمی ہے جس سے آزادی اور غلامی میں چنداں امتیاز نظر نہیں آتا۔ آیئے دیکھیں کہ ''سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے'' کے مصداق کون ''تو'' ہم میں نہیں۔ آیئے دیکھیں کہ اس ہیملٹ کی داستان میں وہ کون سا شہزادہ گم ہے جس سے یہ داستان اس درجہ بے کیف ہو کر رہ گئی ہے۔

1931ء کی مسلم کانفرنس (لاہور) کے خطبۂ صدارت میں اس امر کا ذکر کرتے ہوئے کہ اربابِ کانفرنس نے ایک مفکر (Visionary) کو صدارت کے لئے چنا ہے' علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ:

قومیں فکر سے محروم ہو کر برباد ہو جاتی ہیں!

فِکر سے محرومی:

آج ہماری یہی کیفیت ہے۔ ہم سیاسی آزادی سے تو ہمکنار ہو چکے ہیں لیکن فکر سے محروم اور تہی ہیں۔ آزادی' غیروں کی غلامی (سیاسی استیلاء) کی عدم موجودگی کی سلبی کیفیت کا نام نہیں۔ آزادی' ایک مثبت شے ہے۔ یہ تنہا لا الہ کی وادی میں حاصل نہیں ہوتی بلکہ گلستانِ الا اللہ کی دائمی بہار ہے۔ آزادی ظلمت نہیں کہ عدم نور کا نام ہو بلکہ یہ نور کی مثبت موجودگی ہے کہ جس سے زندگی کا ہر گوشہ صد خاور بداماں ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی خارج سے مسلط نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کا فوارہ اعماقِ قلوب سے پھوٹتا ہے۔ یہ اس وقت تک مثبت کیفیت نہیں بنتی جب تک کہ "ما بانفسہم" کے تغیر و تبدل کی آئینہ دار نہ ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی سرزمین ہمیں صلاحیت کے بغیر مل گئی ہے۔ یہ ہماری سعی و عمل اور تگ و تاز کا نتیجہ نہیں۔ اسی لئے خدا کا یہ بخشیدہ بہشت ''ہیچ'' معلوم ہوتا ہے۔

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد' ہمہ ہیچ\
تا جزائے عملِ تست جناں چیزے ہست\
(اقبالؒ)

اور یہ ہیچ ہی معلوم ہوتا رہے گا جب تک یہ موہبتِ الٰہی اس مقصد کے لئے استعمال نہ ہو جس کے لئے یہ عطا ہوئی ہے۔ اس کا ایسا استعمال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارا پیش نہاد کیا ہے اور وہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ فریضہ صاحبِ فکر کا ہے اور ہماری بدبختی یہ ہے کہ:

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے\
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

ہماری سابقہ سیاست:

ہندی سیاست کا 1920ء تک کا عشرہ ہمہ گیر رقص اور پیچ و تاب کا منظر پیش کرتا ہے۔ ایک عام ہیجان و طوفان تو ضرور تھا لیکن اعمال باطل ہو رہے تھے اور ان کا کچھ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ قوم ایسا تخم بو رہی تھی جس کا کچھ حاصل نہ تھا۔ وہ اس راہ پر

چل رہی تھی جس کی کوئی منزل نہ تھی۔

شاعر کا تصور:

عین اس حال میں ایک صاحبِ فکر نے قوم کو ایک تصور دیا۔ وہ تصور شاعر کا خواب اور مجذوب کی بڑ معلوم دیتا تھا لیکن اس میں جادو تھا۔ اس نے قوم کو قوم بنا دیا۔ بکھرے دانوں کو ایک تسبیح میں پرو دیا۔ دس کروڑ کے ہجوم کو ملتِ واحدہ بنا کر ایک جھنڈے، ایک پلیٹ فارم اور ایک لیڈر سے وابستہ کر دیا۔ انتشار میں مرکزیت پیدا ہو گئی۔ باطل اعمال نتیجہ خیز ہونے شروع ہو گئے اور ائتلاف کی وہ نعمت میسر آنے لگی جو، قرآن کے الفاظ میں، دنیا بھر کے خزانوں کے عوض بھی میسر نہ آ سکتی تھی۔

> ملا کے مقاصد رجعت پسندانہ اور خود غرضانہ ہیں۔ اربابِ اقتدار کی روش منافقانہ ہے۔ عوام کے تحت الشعور میں جو خلش ہے اس کا کوئی علاج نہیں۔ ان کی روٹی کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔ وہ غیر مطمئن ہیں

وَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيۡنَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ (8:63)۔

اور وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں باہم ائتلاف پیدا کر دیا۔ اگر تو وہ سب کچھ خرچ کر ڈالتا جو روئے زمین پر ہے جب بھی ان کے دلوں کو باہمی الفت سے نہ جوڑ سکتا۔ لیکن یہ اللہ ہی ہے جس نے ان میں باہمی الفت پیدا کر دی۔ بلاشبہ وہ (اپنے کاموں میں) غالب اور حکمت والا ہے۔ ائتلاف، وحدتِ مقصد و وحدتِ منزل سے پیدا ہوتا ہے۔ جب مقصد و منزل متعین ہو گئے تو قوم کی ہر حرکت اس متعین منزل کی جانب ہو گئی۔ ملت نے بالآخر اس منزل کو پا لیا۔ لیکن پس چہ؟ وہ منزل، بالذات نہیں بلکہ ایک خوب تر منزل کا سنگِ میل ہے۔

ہندو اور مسلمان میں فرق:

تقسیم ہند سے ایک طرف ہندو نے آزادی حاصل کر لی ہے اور دوسری طرف مسلمان نے ایک قطعۂ ارض حاصل کر لیا ہے۔ ہندو کے نزدیک تصورِ آزادی محض یہ تھا کہ بدیشی راج باقی نہ رہے اور کاروبارِ حکومت دیسیوں، ملکیوں (ہندوؤں) کے ہاتھ میں آ جائے۔ یہ اس کی منزلِ مقصود تھی۔ اب جب وہ یہاں تک پہنچ گیا ہے تو وہ مطمئن ہے کہ وہ آزاد ہو گیا۔ لیکن مسلمان کی حالت مختلف ہے۔ یہ اس موجودہ آزادی کو منزل نہیں متصور کرتا۔ اس کے نزدیک یہ آزادی نشانِ منزل ہے۔ لیکن اب وہ کشمکش میں مبتلا ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

ایک کشمکش:

اس کے تحت الشعور میں ایک خلش ہے، پیہم خلش، جس کا علاج اسے میسر نہیں۔ وہ دنیاوی (سیکولر) حکومت قائم کرتا ہے تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے کہ پاکستان کو اس نے نظامِ قرآن رائج کرنے کے لئے حاصل کیا تھا۔ اگر نظامِ قرآن رائج کرنے کی طرف آتا ہے تو اسے معلوم نہیں کہ اسے کیا کرنا ہے، اور کیسے کرنا ہے۔ قوم ذہنی انتشار میں مبتلا ہے۔ نظامِ قرآن کا خواب کثرتِ تعبیر سے پریشان ہو رہا ہے۔ ماضی کے مخصوص حالات نے ملا کو مذہب کا خصوصی اجارہ دار بنا دیا ہے۔ ملا اسلام وقرآن کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ رجعت پسندانہ، دقیانوسی، اور نا قابلِ قبول و ناممکن العمل ہے۔ اس کے اپنے مقاصد ہیں جن کا وہ تحفظ چاہتا ہے۔ زکوٰۃ، خیرات کی مدات اس کی تحویل میں دے دی جائیں تو وہ مطمئن ہو جائے گا کہ مذہب کی حکومت قائم ہو گئی۔ لیکن یہ ''مذہب'' چند رسوم کا نام ہے غیر مذہبی امور کے لئے ''دنیاوی حکومت'' لازمی ہے۔ دنیاوی حکومت کی زمام مغرب زدہ ہاتھوں میں ہے۔ ان کا مغربی تصورِ اجتماعیت وحکومت، مسلمانوں کے مزاجِ قومی کے مطابق نہیں۔ اربابِ حکومت مغربی فضا کے تربیت یافتہ ہونے کی حیثیت سے معذور ہیں۔ وہ صرف مغرب کا نظام ہی رائج کر سکتے ہیں۔ عوام کا تقاضا اور ان کی کیفیت جداگانہ ہے۔ مسلم لیگ نے اپنی دس سال کی سیاسی جدوجہد میں ان کی تحت الشعوری خلش کو ابھارا کہ پاکستان نفاذ نظام اسلامی کے لئے حاصل کیا جا رہا ہے۔ اگر عوام کو ان خطوط پر نہ تیار کیا جاتا، یا ان کی اس خلش کو یوں برانگیختہ نہ کیا جاتا تو آج ان کا مطالبہ شاید کچھ اور ہوتا۔ مسلم لیگ نے دانستہ ان کو اس طرح ابھارا اور اب کیفیت یہ ہے کہ وہ غیر مطمئن ہیں۔ قیام پاکستان سے صرف وہی طبقات وافراد مطمئن ہو سکے ہیں جن کے قلب میں کوئی خلش نہیں تھی۔ جن کے پیشِ نظر ذاتی مناصب وشخصی منافع تھے اور وہ ان کے حصول میں مصروف ہیں۔ جہاں تک اربابِ حکومت کے مغرب زدہ تصور سیاست کا تعلق ہے، پاکستان کامل جانا اطمینان بخش ہے۔ وہ خود تو مطمئن ہیں لیکن جو مطمئن نہیں انہیں وہ شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ دیوانے۔۔ باغی۔۔ پاکستان کے خلاف ہیں۔

صاحبِ فکر:

عوام غیر مطمئن ہیں کیونکہ ان کی جس خلش کو برسوں ابھارا جاتا رہا اس کی تسکین کا اب کوئی سامان نہیں۔ حتیٰ کہ روٹی کا مسئلہ جو غریب کے سامنے سب سے پہلے آتا ہے، پاکستان میں اس کا بھی اطمینان بخش حل نہیں۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ اس ضمن میں جو حل پیش کرتے ہیں حکومت انہیں شک کی نگاہوں سے دیکھتی ہے (اور دیکھنا بھی چاہیئے) لیکن عوام کی اس مصیبت کا کوئی عملی حل خود پیش نہیں کرتی۔ کرتی فقط اتنا ہے کہ عوام کو ان کمیونسٹ وغیرہ سے دور رکھنے کے لئے اسلامی کمیونزم وغیرہ قسم کی مغالطہ انگیز اصطلاحات سے کام لیتی ہے۔ اس روش نے اوپر کے طبقہ کو منافق بنا دیا ہے۔ منافقت پھر عدم اطمینان کا باعث ہے۔ اطمینان اسلام میں ہے، منافقت میں نہیں (منافقین کے لئے جہنم میں بھی درک اسفل ہے) پھر دیکھئے کہ قوم کی

حالت کیا ہے؟ ملا کے مقاصد رجعت پسندانہ اور خود غرضانہ ہیں۔ اربابِ اقتدار کی روش منافقانہ ہے۔ عوام کے تحت الشعور میں جو خلش ہے اس کا کوئی علاج نہیں۔ ان کی روٹی کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔ وہ غیر مطمئن ہیں۔ جنوں زدہ طبقہ میں بغاوت کے آثار ہویدا ہیں۔ ایسے میں کیا ہوگا؟ اس عدم اطمینان اور منافقت کے طبقاتی گرداب سے قوم بچ سکتی ہے تو کسی صاحبِ فکر کے صدقہ میں بچ سکتی ہے۔ مسلمانوں کا صاحبِ فکر، اقوامِ دیگر کے اصحابِ فکر سے مختلف اور نرالا ہوتا ہے۔ یہ صاحبِ فکر ہی نہیں ہوتا صاحب جنوں بھی ہوتا ہے۔ اس میں عشق وعقل نظر اور خبر کا امتزاج ہوتا ہے۔ وہ تنہا عقل نہیں ہوتا کہ مصلحت کوشیوں پر نگاہ رکھے اور جرأت رندانہ سے محروم ہو نہ وہ محض جنوں ہوتا ہے کہ اسے پاسِ گریباں بھی نہ ہو۔ وہ اس کی تفسیر ہوتا ہے کہ

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
درجنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ مستقبل اس کے ہاتھ میں ہے جس کا سینہ کشمکش کی آماجگاہ ہے کیونکہ

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

ایسا صاحبِ فکر کہ اس کے سینہ میں قرآن کی تڑپ ہو۔۔ اس کے فکر کی روشنی میں قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو ایسا نظام متعین ہوسکتا ہے جس میں ہر ایک کو صحیح اطمینان حاصل ہو جائے اور ملت اس نورِ ربانی کی روشنی میں اپنی منزل صحیحہ کی جانب گامزن ہو سکے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر وہ حقیقی آزادی میسر آئے گی۔ جس کے بغیر ہماری موجودہ آزادی ایک بادہ ہے بے کیف' ایک جسد ہے بے روح۔ اس کے بغیر ہم آئینی آزادی سے تو شاید ہمکنار رہ سکیں' اس حقیقی آزادی کو کبھی پا نہیں سکیں گے جو ان بے شمار اطواق وسلاسل کو توڑتی ہے جو انسان نے از خود پہن رکھی ہیں۔ آزادی کے یوم ہر سال آئیں گے اور گزر جائیں گے۔ ہم خوشیاں بھی منائیں گے' لیکن اس استخواں خوری سے کچھ نفع نہیں ہوگا' جب تک ہم مغز تک نہیں پہنچیں گے' یومہائے آزادی کے جشن بے روح بن کر رہ جائیں گے اور بس۔

> ملا اور اربابِ حکومت میں سمجھوتہ ہونے کے امکانات قوی ہیں۔ ایسا ہو گیا تو ہماری ساری جدوجہد اکارت جائے گی اور تاریخ نئے اوراق الٹنے کے بجائے پرانے اوراق الٹے گی۔ ہم غیروں کی غلامی سے آزاد ہو کر اپنوں کے غلام ہو چکے ہوں گے

نئی غلامی:

اس حقیقی آزادی کے حاصل نہ ہونے سے پاکستان کے قیام نے ہم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی اور ہم بدستور وہیں ہیں جہاں قیامِ پاکستان سے پیشتر تھے۔ ہم اگر بدستور فروعات میں الجھے رہے اور ظواہر ورسوم کے غلام بنے رہے تو جو کچھ ہونے

والا ہے اس کا عکس ابھی سے دیکھ لیجئے۔ ملا اور ارباب حکومت میں سمجھوتہ ہونے کے امکانات قوی ہیں۔ ایسا ہو گیا تو ہماری ساری جدوجہدا کارت جائے گی اور تاریخ نئے اوراق الٹنے کے بجائے پرانے اوراق الٹے گی۔ ہم غیروں کی غلامی سے آزاد ہو کر اپنوں کے غلام ہو چکے ہوں گے۔۔ پاکستان باقی مسلمان سلطنتوں کی طرح ایک سلطنت بن جائے گی' فرق صرف یہ ہو گا۔ ''تخت و مصلیٰ'' کا یہ سمجھوتہ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک عظیم حادثہ ہوگا۔ ایسا حادثہ جس سے جانبر ہونا صدیوں کی بات ہو جائے گی۔

عزمِ محکم:

لہٰذا' آیئے! یوم آزادی منانا ہے تو عہد کیجئے کہ حقیقی آزادی سے ہمکنار ہو کر رہیں گے۔ اس کی یہی صورت ہے کہ قرآن نے جن اطواق وسلاسل کو ایک بار توڑا تھا اور جن کے ٹوٹے ہوئے حلقوں کو جوڑ کر ہم نے پھر وہی زنجیریں تیار کر لی ہیں' آج پھر ان زنجیروں کو ایک جھٹکے سے توڑیں اور حیات اجتماعیہ کو اس قالب میں ڈھال لیں کہ محکومیت صرف اللہ کی جائز ہے' انسان کو انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں۔ انسان' نہ حاکم ہے نہ محکوم۔ وہ خدائی قوانین کا نافذ کرنے والا اور آپس میں ائتلاف اور محبت سے کام لینے والا ہے۔ گویا بالفاظِ صحیح تر' ہم قرآن اور اسلام کا نظام اپنے اوپر مسلط کریں اور انسانیت کو حقیقی آزادی سے ہمکنار کرائیں۔ یاد رکھئے! یہ تسلط صرف قدمِ اول کا منتظر ہے۔ آیئے جرأتِ ایمان سے کام لیں اور یہ قدم اول اٹھائیں۔

لیکن اس ''زورِ جنوں'' میں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ ہونے دیجئے کہ جس نظام کو ہم مسلط کرنا چاہتے ہیں وہ اس سرزمین کے ٹکڑے کے بغیر کبھی مسلط نہ ہو سکے گا جو ہمیں خدا کی موہبت سے مل گیا ہے جسم کے بغیر اس عالم اسباب میں' جان کا تصور ممکن نہیں۔ اس لئے اس قطعۂ زمین کا تحفظ نہایت ضروری ہے کہ

غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

اس سرزمین کی بخشائش پر ہماری گردنیں اس بارگاہ صمدیت کے حضور' فورِ تشکر و امتنان سے جھک جاتی ہیں جس نے ہم ناتوانوں کو اس عطیۂ عظمیٰ سے نوازا۔ اسی سے ہم استعانت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس سرزمین کو اس کے تخت اجلال کی جولانگاہ بنا سکیں۔

اور جب خدا کے حضور سجدۂ تشکر کا ذکر آیا ہے' تو بعید از سپاس گزاری ہوگا اگر ہم قوم کے اس ''مخلص وکیل'' کا شکریہ ادا نہ کریں جس نے اپنی فراست و دیانت سے اتنا عرصہ بلا مزد و معاوضہ قوم کا مقدمہ لڑا' اور اسے اس سرزمین کا قبالہ لے دیا۔ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں اس محسنِ ملت کی زیر بارِ احسان رہیں گی۔ لیکن پاکستان کا استحکام اس ''قبالہ'' حاصل کر لینے سے نہیں ہوگا۔ یہ مشروط ہوگا ہماری اپنی صلاحیتوں پر۔ اور یہ صلاحیتیں ''ایمان و اعمال صالحہ'' کے بغیر ناممکن ہیں۔

جمیل احمد عدیل

تبدیلی کی ابتداء

تبدیلی کبھی بھی طاقت سے نہیں آتی۔ مراد یہ کہ خارجی دباؤ سے فرد کے اندر کوئی تغیر رونما نہیں ہوسکتا۔ ہاں مفاہمت ہو سکتی ہے، جس کا نسبتاً کھرا نام منافقت ہے۔ اگر کوئی صورتحال کو دل سے بدلنے کا متمنی ہے تو پھر اسے نہایت مضبوط اعصاب کا مالک ہونا چاہئے۔ ایک ایک فرد سے رابطہ ضروری ہے۔ اس کے ذہنی معیار کے مطابق گفتگو ناگزیر ہے۔ فوری متوقع ریسپانس نہ ملنے کی صورت میں دل برداشتہ نہیں ہونا بلکہ پوری استقامت کے ساتھ پیغامِ حق، اپنی خالص شکل میں باطل کی معمولی سی ملونی کے بغیر مخاطب تک متواتر پہنچاتے رہنا ہے۔ سب سے بڑھ کر جسے آپ سچ سمجھتے ہیں، ہمہ وقت یہ دھیان رکھنا ہے کہ کہیں غیر شعوری طور پر بھی آپ کا عمل، اس سچ کی نفی نہ کردے ورنہ برسوں کی ریاضت عموماً اس ایک کمزور ساعت کی نذر ہوجاتی ہے۔ یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے۔

اب تبدیلی کا خواب سب دیکھ رہے ہیں۔ ہماری بات میں تاثیر اس لئے نہیں رہی کہ ہمارے اقوال ہمارے اعمال کی تائید سے یکسر تہی ہیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے طریق کار میں فاش تکنیکی خامیاں ہیں۔ مثلاً ہمیں یہ تک معلوم نہیں کہ ہمارا اپنا ''نظریہ حیات'' کیا ہے؟ زبان کی حد تک سب مسلمان ہیں، قرآن پر ہمارا ایمان ہے، پاکستان ہمارا امان ہے، مگر سمتیں بالکل برعکس ہیں، مسافتیں اور منزلیں اور۔ دیکھئے بعض باتیں مشکل ہوتی ہیں، بعض ناممکن۔ یہ ناممکن ہے کہ آپ کسی سچ کو بغیر تجربی شہادت کے تسلیم کرلیں، چاہے اس کی سطح کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں۔ اور جہاں جانے بوجھے پرکھے بنا کچھ ''تسلیم'' کر لیا جائے، اس کے نتائج من وعن وہی نکلتے ہیں جنہیں ہم کئی دہائیوں سے بھگت رہے ہیں۔ مثلاً ہم نے مان لیا کہ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ پھر ہم اللہ کی اس کتاب سے راہنمائی کیوں نہیں لیتے؟ اس لئے کہ جدید زندگی کے مسائل کا حل ''ڈھونڈنے والوں'' نے اس میں سے ڈھونڈا ہی نہیں۔ ہاں اس کے متوازی جو حل مختلف اقوام نے تلاش کئے ہیں، ان ریڈی میڈ' حلات' پر ہی ہم بھی انحصار کررہے ہیں۔

مانا کہ یہ المیہ ہے پر ہم کریں کیا؟ ہمارے پاس کیا اس کے علاوہ Choice ہے؟ یا پھر جو حل ہمارے اکابرین نے دریافت کئے ہیں، ان پر Depend کریں؟ اس کا حال سن لیں، اس وقت دنیا کے پچاس ممالک Live دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ایک ''قوم''، ایسی بھی بستی ہے جو اپنی مشکلات استخاروں کی وساطت سے دور کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ اس قوم کا کوئی فرد

بیمار ہو جائے تو وہ تعویذ سے درست ہو جاتا ہے۔ کوئی معاشی مسئلہ ہو، عامل کسی جن کو Depute کر دیتا ہے، آناً فاناً مال کی فراوانی ہو جاتی ہے۔ نجومی کی ہدایت کے مطابق لوگ باگ سفر کرتے ہیں۔ اور بامراد لوٹتے ہیں۔ جادوگر کالونیاں تعمیر کرتے ہیں، یوں بے گھروں کو گھر مل جاتے ہیں۔ شادی تک کے معاملات یہی پروفیشنل ساحر اور ٹونے کے ماہر طے کرتے ہیں، نتیجہ معلوم ہر گھر میں ایسی خوشگوار ازدواجی زندگی رقص کناں ہے کہ عالم میں نظیر نہیں ملتی۔ عدالتیں، پولیس اور دیگر اداروں سے بے نیاز اس دھرتی میں تمام وارداتوں کی تفتیش ''بابے'' کرتے ہیں۔ بے گناہوں کو باعزت بری کر دیتے ہیں اور گناہگاروں کو عبرت کی مثال بنا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس ملک میں ٹریفک پولیس تک موجود نہیں ہے۔ رجال الغیب ہر سڑک/ چوراہے میں تعینات ہیں جو نظر تو نہیں آتے مگر پوری ٹریفک کو اس طرح کنٹرول کرتے ہیں کہ کبھی کوئی بدنظمی ہوئی ہے نہ کوئی حادثہ ہی کبھی رونما ہوا ہے......!

ہماری پستی کا کیا کوئی اندازہ کر سکتا ہے، ہم کس پاتال میں جا گرے ہیں؟ یاد رکھئے جب تک ہم اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر لیتے کہ اللہ کے قوانین ناقابلِ تبدیل ہیں، کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر اس کا ایک قانون ہے کہ وہ رنگ و نسل و عقیدہ و قومیت کی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہیں رکھتا۔ اب اس ضابطے کو کوئی بدل کر دکھائے۔ نہیں بدل سکتا۔ دنیا کی ساری قوتیں مل کر بھی اسے تبدیل نہیں کر سکتیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ایک اور قانون بھی فعال ہے کہ سطح ارض پر مقیم جو قوم بھی جس نوعیت کی محنت کاوش کرے گی، وہ اس کے مطابق متعین نتیجے سے لازماً ہمکنار ہوگی۔ مثلاً ''بے دین'' سائنسدان لیبارٹری میں دس برس کھڑے ہو کر کسی مسئلے پر تحقیق کرتے رہیں جب وہ آخری نتیجے کو رقم کرنے لگیں تو غیب سے موکل آ کر انہیں اور ان کے سارے کام کو راکھ کی چٹکی میں بدل دیں۔ کبھی ایسا ہوا ہے نہ ہوگا۔ اس کے برعکس پانچ سات سو پختہ عقائد کے مالک چار چھ برس ایک وسیع و عریض حجرے میں اپنے مخصوص وظیفے چلے کرتے رہیں، آخری دن دنیا یہ دیکھے کہ زمین اپنے سارے خزانے اگل رہی ہے۔ پٹرولیم کی مصنوعات سے لے کر چاندی سونے کے زیورات سب قطار باندھے تشریف لا رہے ہیں۔

ایسے سپنے دیکھنا ''عقلمندوں'' کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔ ایک پسماندہ اور ترقی یافتہ قوم کے بیچ بنیادی فرق یہی ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ قوم نے Cause کا Effect کے ساتھ رشتہ ڈھونڈ لیا ہوتا ہے جبکہ پسماندہ قوم کے افراد توہمات کے پجاری ہوتے ہیں۔ آپ غور کریں کہ بنا کوشش کئے جب ہم اوپر والے سے حسبِ ضرورت کچھ طلب کرتے ہیں اور ہماری وہ مانگ پوری نہیں ہوتی تو ہمارا وجود مایوسی کے صحرا کے ایک قدم اور قریب نہیں ہو جائے گا؟ کب تک جعلی پیر سائیں کی تاویلات آپ کو خوش گمانی کے نخلستان میں روکے رکھیں گی؟ زیادہ سے زیادہ یہی کہ بچہ مناسب علاج نہ ہونے کے سبب مر گیا، کوئی بات نہیں، اس میں بھی کوئی حکمت ہوگی، اور حکمت یہ ہوگی کہ اس نے بڑے ہو کر کافر ہو جانا تھا۔ بھئی کافر ہو جانا تھا تو اسے دنیا میں آنے ہی نہ دیا جاتا اور جوان گنت کافر دندنا رہے ہیں، ان کی اس ''دندناہٹ'' میں کیا حکمت کارفرما ہے؟

یارو! اب اس پھندے سے نجات پالو کہ بہت ہو چکی۔ کل کو اپنے خالق و مالک کی عدالت میں حاضر بھی ہونا ہے' کیا منہ لے کر جائیں گے؟ کیسے اس کا سامنا کریں گے؟ کیا وضاحت پیش کریں گے؟ جب اس نے کہا: بھئی یہ سب کچھ جو تم کہتے/کرتے رہے' میں نے تو تمہیں اس کا کبھی حکم نہیں دیا تھا۔ میں تو اسباب کے ذریعے تم تک پہنچا تھا اور تم نے میرے ہی خلق کئے ہوئے اسباب کی اس قدر توہین کی کہ ان پر انحصار کو کفر تک بتاتے رہے۔ اب بتاؤ تمہارا ٹھکانا کیا ہے؟

سو آخر میں ہمیں یہی عرض کرنا ہے کہ قرآنی طرزِ احساس کو شعور کا جزو بنانے کے لئے ضروری ہے کہ تبدیلی کی ابتدا فکر و نظر سے ہو۔ عام آدمی کو بھی یہ سمجھایا بتایا جائے کہ خدا کا مطلب خود فریبی نہیں بلکہ اس کے قوانین کی اطاعت ہے۔ اور اس کے یہ قوانین کائنات' معاشرے اور فرد کی ذات میں یکساں حیثیت سے نافذ العمل ہیں۔ کہیں بھی ان قوانین میں تعطل یا استثناء نام کی کوئی چیز نہیں آتی' آ ہی نہیں سکتی۔ اگر اس نے اپنے قوانین کو تبدیل کرنا ہوتا تو کیا وہ انہیں حتمی صورت اور قطعی حیثیت میں اپنی آخری کتاب میں بیان کرتا؟ ممکن ہے اپنے صدیوں پرانے محلات کوز میں بوس ہوتے دیکھ کر شاہانِ علم یہ فرمائیں کہ خدا قادرِ مطلق ہے' وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے۔ تو آپ ان سے بڑے ہی احترام کے ساتھ کہئے۔ ہاں بلاشبہ وہ قادر مطلق ہے' مگر وہ کسی قاعدے' قانون' ضابطے' آئین کے مطابق ہی نظامِ ہستی کو چلا رہا ہے۔ کیا اس کے قادر مطلق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ نظامِ عدل کی بجائے ظلم کے ''سسٹم'' کے مطابق بھی اسی طرح جب چاہے کائنات کو چلائے گا؟

اگر اس نے ایک ضابطہ جاری کر دیا ہے کہ فلاں فلاں رشتے حرام ہیں' ان سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ تو کیا معاذ اللہ وہ قیامت تک کبھی اس ضابطے کو توڑنے کے بارے ارادہ بھی کرے گا؟ نہیں وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ اس نے اگر انبیاء کے سلسلے کو اپنے پیارے رسول حضرت محمد ﷺ پر ختم کر دیا ہے تو اب اس کی ''قدرت'' کے امتحان کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ وہ کسی اور نبی کو مبعوث کرے؟ جو لوگ خدا کی ''قدرت'' کے دوسرے رنگ میں قائل ہیں' انہیں دوٹوک الفاظ میں پوچھیں' جناب! فرمائیں' محمد عربی ﷺ کو آخری نبی بنا کر' قرآن کو آخری کتاب قرار دے کر' اسلام کو آخری دین کا ٹائٹل دینے کے بعد وہ اب ان ضابطوں کو تبدیل کر سکتا ہے؟

ظاہر ہے کوئی صاحبِ ایمان کبھی ہاں میں جواب نہیں دے گا' تو پھر ان نکتوں سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جزا سزا کے ضابطے سے بچنے کے لئے یہ راہِ فرار تلاش کرنا ہماری اپنی فکری کجی ہے کہ وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے۔ جس کو چاہے بغیر کسی وجہ کے جہنم میں پھینک سکتا ہے' جس کو چاہے بغیر کسی سبب کے جنت کا حق دار قرار دے سکتا ہے۔ نہیں میاں! وہ عادل ہے۔ وہ ظالم نہیں۔ اس نے جب خود کو عادل کہا ہے تو اسے ظالم ثابت کرنا (ہمارا یہ رویہ) ظلمِ عظیم ہے یا نہیں؟ لہٰذا آیئے اور ابھی سے ذہنی تبدیلی کے عمل کا حصہ بن جایئے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے خود اپنے فکر و نظر کو درست کیجئے پھر اپنے عمل کی گواہی لایئے اور پھر دیکھئے کیسے انقلاب آتا ہے!!!

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

نظریۂ پاکستان کا مفہوم

نظریۂ پاکستان کی بنیاد انسانی معاشرتی زندگی کے آغاز ہی سے نظریہ اسلام کے دوقومی نظریہ سے اخذ کی گئی ہے' جو حضرت نوحؑ (قرآن میں جن کے ذکر سے انبیاء کرام کے ذکر کا آغاز ہوتا ہے) سے لے کر تمام انبیاء کرام اپنے زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ پیغام کو ''الحق'' کی صورت میں لوگوں کو پیش کرتے رہے ہیں۔ اُن میں جو صاحبِ فہم و شعور سوچنے اور سمجھنے کے باوجود اپنے عقائد ہی پر رہتے اور خدائے واحد کی فرمانبرداری (الحق) سے انکار کر دیتے' وہ اپنی پہلی قوم کے فرد کے نام سے پہچانے جاتے۔ جو لوگ اللہ کے پیغام پر ایمان لا کر اللہ کی فرمانبرداری میں رسول کا ساتھ دیتے' وہ اپنی قوم سے علیحدہ دوسری قوم (مسلم کے نام سے) کے طور پر متعارف ہوتے۔ اس طرح آغاز ہی سے ایک قوم کی بجائے دو قومیں وجود میں آ گئیں۔ ان دونوں قوموں کی نسل ایک تھی' زبان ایک تھی اور قبیلہ بھی ایک تھا' لیکن اس کے باوجود نظریہ کے اختلاف سے ایک قوم دو قومیں بن گئیں۔ اسے ہی آج کی زبان میں نظریہ کا اختلاف کہا جاتا ہے' لہٰذا اسے ہم دوقومی نظریہ کا نام دے سکتے ہیں۔ اللہ کا یہ پیغام اب اپنی مکمل شکل میں آخری مرتبہ قرآن میں تمام نوعِ انسانی کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اب بنیادی طور پر جو لوگ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں' اُنہیں مومنین کی جماعت میں شمار کیا جاتا ہے اور ایک علیحدہ قوم کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ قرآن اور اُسکے پیغام سے انکار یا کفر کرتے ہیں' وہ کفار کی جماعت میں شامل اور دوسری علیحدہ قوم تصور کئے جاتے ہیں۔ فرمانِ خداوندی ہے:

> نظریۂ قرآن ہی کو نظریۂ پاکستان کی شکل میں سامنے لانے میں علامہ اقبالؒ اور اس تصور کو مملکتِ پاکستان کے حصول کو عملی جامہ پہنانے میں قائداعظمؒ کا نام لیا جاتا ہے۔ ان دونوں کا مشترکہ موقف یہی ہے کہ نظریۂ پاکستان دراصل نظریۂ اسلام ہی ہے' جس کا ماخذ قرآن کریم ہے

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (64:2)

(وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا تو تم میں کوئی کافر ہے اور تم میں کوئی مؤمن)۔

کافر تو وہ ہے جو بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا (5:44) اور اپنے عمل کے اعتبار سے ظالم (5:45) اور فاسق بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:47) ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابل مؤمن وہ ہے جو بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق شرائطِ ایمان پوری

کرتا اور اعمالِ صالحہ کی بجا آوری سے تقویٰ شعار ہوجاتا ہے (4:136؛2:177) وہ اقامتِ دین کرتا ہے اور دین میں تفرقہ پیدا نہیں کرتا (42:13)۔ اُسوۂ رسول ﷺ کے مطابق غلبۂ اسلام کے لئے تگ و تاز کرتا ہے (61:0; 48:28; 33:21; 9:33) حصولِ جنت کے بدلے اپنا مال اور جان اللہ تعالیٰ کے فرمودہ مقاصد کے لئے بے دریغ قربان کر دیتا ہے (9:111)۔ میزانِ خداوندی میں یہ کافر اور مؤمن کبھی برابر نہیں ہوتے۔ (68:35; 45:21; 38:28)۔

صاحبِ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے حامل افراد کے لئے اللہ تعالیٰ نے استخلاف فی الارض اور دین کے تمکن کا وعدہ فرمایا ہے جس میں خوف کی فضا ختم ہو کر امن میں تبدیلی ہوجاتی ہے (24:55)۔ یہ ہے نظریۂ پاکستان کا مفہوم۔ یہی بات ہمارے ہاں دوقومی نظریہ کے نام سے متعارف ہے۔

علامہ اقبال کا موقف:۔......علامہ اقبالؒ نے اپنی طرف سے کوئی نیا نظریۂ پاکستان متعارف نہیں کرایا، بلکہ اسی دوقومی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان میں آباد مسلمانوں کا قرآن پر ایمان رکھنے کی وجہ سے اور ایک علیحدہ قوم کا تشخص رکھنے کی بنا پر علیحدہ وطن کا مطالبۂ پاکستان پیش کیا، جو زبانِ زدِعام میں نظریۂ پاکستان کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ اسے انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد 1930ء میں اپنے خطبۂ صدارت میں ان الفاظ میں پیش کیا کہ ''مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے''۔ مسلمانوں کی اسلامی ریاست کی وضاحت انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں یوں کی کہ

''گر تو می خواہی مسلمان زیستن۔ نیست ممکن جز بقرآن زیستن''

اگر تو مسلمان کی زندگی گزارنے کا خواہشمند ہے، تو قرآن کی ہدایت سے باہر زندگی گزارنے کا خیال ہی ناممکن ہے۔ اسی دوقومی نظریہ کی بنا پر پاکستان کی اسلامی ریاست میں قرآن کی اہمیت اور وضاحت علامہ اقبالؒ نے سید سلیمانؒ ندوی کے نام خط میں یوں کی کہ ''قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کی مدعی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیاسیاتِ انسانیہ کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔

''قائداعظمؒ کا موقف:

نظریۂ قرآن ہی کو نظریۂ پاکستان کی شکل میں سامنے لانے میں علامہ اقبالؒ اور اس تصور کو مملکتِ پاکستان کے حصول کو عملی جامہ پہنانے میں قائداعظمؒ کا نام لیا جاتا ہے۔ ان دونوں کا مشترکہ موقف یہی ہے کہ نظریۂ پاکستان دراصل نظریۂ اسلام ہی ہے، جس کا ماخذ قرآن کریم ہے۔ علامہ اقبال کے موقف کا مختصر جائزہ لیا جا چکا ہے اور اب یہاں قائداعظمؒ کے موقف کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے نظریۂ پاکستان کی وضاحت عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سوال کے جواب میں (1941) یوں کی کہ ''اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآن حکیم کے احکام ہی

سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''نظریۂ پاکستان اور نظریۂ قرآن کو ایک دوسرے کے مماثل قرار دینے کے اپنے موقف کا اظہار' قائداعظمؒ نے اپنے 1935ء کے عید کے پیغام میں دو ٹوک الفاظ میں یوں بیان کیا کہ ''اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ حیات ہے جو معاشرت' مذہب' تجارت' عدالت' دیوانی' فوجداری' اور تعزیرات کے ضوابط اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی تقاریب ہوں یا روزمرہ کے معمولات' روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا' اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا' عام اخلاقیات ہوں یا جرائم' دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے رسولِ اکرم نے حکم دیا تھا کہ ''ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح خود اپنا پیشوا بن جائے''۔ اس لئے اسلام صرف روحانی نجات اور مذہبی رسوم و پوجا پاٹ تک محدود نہیں۔ یہ مسلم معاشرہ کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے خواہ وہ فرد پر لاگو ہو یا پورے اجتماع پر۔

''نظریہ کی حد تک تو ہم نے نظریۂ پاکستان کے مفہوم میں دیکھ لیا کہ یہ قرآن کریم پر ایمان رکھنے کی بنیاد پر ایک علیحدہ قوم کے تشخص کا حامل ہے' لیکن کیا یہ ممکن العمل ہے؟ اس کا جواب اگر نفی میں ہے' تو اس کی اہمیت نہیں رہتی۔ اس لئے ہمیں اس نظریۂ پاکستان کے ممکن العمل ہونے کا جائزہ لینا ہوگا۔ نظریۂ پاکستان (قرآن) پر مبنی اسلامی مملکت کا قیام...... اسلامی مملکت کے قیام اور اُس کے دستور کے نفاذ میں ہمیں رسولِ اکرم ﷺ کے درجِ بالا فرمان کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا' جس میں اُنہوں نے فرمایا کہ ''ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح خود اپنا مذہبی پیشوا بن جائے''۔ یہ فرمان دراصل قرآن ہی کی ترجمانی کرتا ہے کہ ''بے شک رسولُ اللہ کی زندگی ہر شخص کے لئے بہترین نمونہ تھی (اور ہے)' جو اللہ اور آخرت کی خوشگواریوں اور کثرت سے ذِکرُ اللہ (قانون خداوندی) کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھے (33:21)''۔ رسولِ اکرم ﷺ نے نبوت کے پہلے تیرہ (13) برس اُمت کو تیار کرنے میں لگا دیئے۔ اُس کے بعد بھی نامساعد حالات ہونے کی وجہ سے اپنے رفقاء کے ہمراہ ہجرت تک کرنا پڑی۔ وہاں مدینہ میں بھی بتدریج اسلامی مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے اور قرآنی دستور کے نفاذ میں ایک طویل مدت لگ گئی۔ ہم کوشش کریں گے کہ قرآن کی روشنی میں اُٹھائے گئے بتدریج اور ترتیب وار اقدامات کا مختصر سا جائزہ پیش کر سکیں۔

1-(پہلی منزل) قرآن (الحق) کا نوعِ انسانی کے سامنے رکھنا:

اللہ نے قرآن نازل اس لئے کیا ہے تاکہ حق کو لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ اللہ کی طرف سے یہ انسان کا بنیادی حق ہے تاکہ وہ اپنے انتخاب کی بنا پر کئے گئے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے۔ اسی کی وضاحت قرآن میں (18:29) ہے کہ ''(لوگوں) سے کہہ دو کہ تمہارے رب کی طرف سے حق آ گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لائے اور جس کا جی چاہے

اس سے کفر کرے''۔حق کو انسان کے سامنے لایا جائے تو ہی ایمان لایا جاتا اور کفر کیا جاتا ہے۔اس کی غیر موجودگی میں انسان بے خبر کہلائے جانے کا مستحق ہوتے ہیں۔اسی لئے رسول ﷺ کی طرف وحی کے ذریعے الحق کا نزول کرنے کے ساتھ ہی یہ اللہ کی طرف سے رسول ﷺ کا فریضہ ہوتا تھا کہ وہ اسے لوگوں تک پہنچانے میں کسی قسم کی کوتاہی کے مرتکب نہ ہوں۔ 2-(دوسری منزل) قرآن کی طرف دعوت وتبلیغ۔مثالی حالت تو یہی سمجھی جاتی ہے کہ انسان کے دل میں اور خود اپنی فکر سے حق کی طرف میلان پیدا ہو جائے (Ideal position) اور اس کے نتیجہ میں ایمان لائے۔اس ایمان میں اگر کسی قسم کا تذبذب یا کمی رہ جائے' تو ابلاغ کے ذریعے ایمان میں پختگی پیدا کرنے کا بندوبست کرنا چاہئے۔اس منزل میں اس کی بھی اُمید کی جاتی ہے کہ جہاں حق کا پیغام ابھی تک نہیں پہنچا' وہاں الحق کی طرف دعوت دی جائے۔3-(تیسری منزل) مومنین کی جماعت کی تشکیل۔اس منزل میں جو لوگ ایمان لے آتے ہیں' اُن سے رابطہ کیا جاتا ہے۔اس میں جن افراد کے قلب ونگاہ میں تبدیلی پیدا ہو چکی ہوتی ہے' اُن کو ایک جماعت میں تشکیل دے کر اجتماعی قوت میں اضافہ کیا جاتا ہے۔اس طرح مصائب کا مقابلہ اور دفاع کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے اور مقاصد کے حصول میں مدد مل جاتی ہے۔4-(چوتھی منزل) جماعت مومنین کی تعلیم وتربیت۔قلب ونگاہ کی تبدیلی کے بعد جماعت کی تشکیل کے موقعہ پر انفرادی طور پر اور اسلامی حکومت کے تشکیل ہو جانے کی صورت میں ابتدائی طور پر ہی تعلیم وتدریس کے ذریعے ایمان کو مزید پختہ کیا جاتا ہے۔قرآن حکیم نے حضور نبی اکرم کا فریضہ زندگی یہ بتایا ہے((62:2 کہ''وہ کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے''۔اس سے اس حقیقت کا افشاء مقصود تھا کہ کوئی بچہ کسی نظریہ کو ساتھ لے کر دنیا میں نہیں آتا۔آپ جس نظریہ کا حامل اپنی قوم کو بنانا چاہتے ہیں' مسلسل تعلیم وتربیت سے اس نظریہ کو بچوں کے قلب ودماغ کی گہرائیوں میں پیوست کرتے جائے تا کہ ایمان میں مزید پختگی آتی جائے۔اس ضمن میں مترفین (طاقتور استحصالی طبقہ) کی طرف سے مشکلات اور مختلف اذیتوں کا سامنا کرنا پڑے' تو اسے صبر اور پورے عزم کے ساتھ برداشت کرنا پڑے گا۔یہ وقت بھی آسکتا ہے کہ آپ کو دوسرے مقام پر' جہاں حالات نسبتاً زیادہ سازگار ہوں' ہجرت کرنے کا انتخاب کرنا پڑے۔ 5-(پانچویں منزل) اسلامی مملکت کا قیام اور قرآنی دستور (نظریۂ پاکستان) کا نفاذ۔ اس آخری مقام کو نہایت مختصر مومنین کی جماعت کی معیت میں ممکن العمل شکل دینے کے لئے رسولِ اکرم نے بتدریج قرآن کریم کے نازل شدہ ترتیب وار احکام کی روشنی میں اسلامی مملکت کے قیام کو عملاً قائم کر دیا۔اسی طرح نظریۂ پاکستان (قرآن) کا عملاً نفاذ ایک اسلامی حکومت علی منہاجِ النبوت رسولِ اکرم ﷺ کے طریق کے مطابق ممکن العمل بنا سکتی ہے۔اس طرح کہ ابتدائی منازل میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد پاکستان کی آزاد مملکت اس امر کا اعلان کر دے کہ اس کا تمام کاروبارِ مملکت قرآن کے مطابق ہو گا۔قرآن حکیم میں کچھ احکام وقوانین متعین شکل میں دئے گئے ہیں اور بعض اقدار اصول کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔یہ سب غیر متبدل اور تمام مسلمانوں پر ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے دی گئی ہیں۔جن اقدار کے صرف اصول دئے گئے ہیں' مملکت کے اربابِ فکر ونظر' با اختیار نمائندگانِ ملت ان اصولوں کی روشنی میں' اپنے

تقاضوں کے مطابق، ان کے جزئی قوانین مرتب کریں گے۔ جو کچھ اسلاف سے چلا آ رہا ہے، اُن پر باقاعدہ غور وفکر اور مشاورت کے بعد، اُن میں جو قوانین قرآنی اصولوں کے مطابق اور ہمارے زمانے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں، انہیں ایسا ہی باقی رہنے دیا جائے گا۔ اس بقاء میں قرآن کے اس اصول کو بھی ملحوظِ نگاہ رکھا جائے گا کہ (13:17) ''دنیا میں بقاء اُس اصول میں ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہو''۔ جن اصولوں میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی، ان میں قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے تبدیلی کر لی جائے گی۔ جہاں نئے قانون کی ضرورت ہوگی، قرآن ہی کی حدود میں نیا قانون بنایا جائے گا۔ اس طرح قرآن کے اصول غیر متبدل رہیں گے اور ان کے اندر وضع کردہ قوانین زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ بدلتے جائیں گے۔ ایسی مملکت نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر استوار ہوگی۔

قرآنی دستور (نظریۂ پاکستان) کے بتدریج نفاذ میں ہمارا مسئلہ:

یہ درست ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نبوت کے پہلے تیرہ برس تک اُمت کو تیار کیا اور اُس کے بعد اپنی مملکت کے حصول میں اسلامی دستور کو نافذ کیا۔ اس کے برعکس پاکستان میں ہماری قوم کی تربیت ہوئی نہیں اور ہم اسلامی دستور (نظریۂ پاکستان) نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ تدبر کا مقام یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ معاشرہ کس منزل کی حالت میں ہے اور پھر اس کے مدِنظر عمل کیا جائے۔ جس منزل کی حالت میں آپ کا معاشرہ ہے، اس سے متعلق قرآن مجید میں کیا احکام اور راہنمائی ہے، جسے اس کے مطابق زیرِ عمل لانا ہوگا اس لئے کہ ہر منزل کے ترتیب وار پروگرام کو کامیابی سے پورا کرتے ہوئے بتدریج ہم آگے کی منازل میں قدم رکھ سکتے ہیں۔ اس ضمن میں رفتہ رفتہ عمل کی دعوت دیتے ہوئے قرآن کریم ایک پورا پروگرام دیتا ہے۔ پہلی منزل سے آخری منزل تک مختلف مدارج میں سے گزارتا ہوا لے جاتا ہے۔ ہر منزل کے متعلق اس میں ہدایات، راہنمائی اور احکام موجود ہیں یہی مدارج طے کراتے ہوئے رسول اکرم اسلامی مملکت (ہماری زبان میں میں نظریۂ پاکستان) کے حصول میں کامیاب ہو سکے۔ یہی اللہ کا متعین کردہ اصول ہے جس میں نہ تبدیلی ممکن ہے اور نہ ہی کسی قسم کا استثناء موجود ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہمارا معاشرہ آج کس منزل میں کھڑا ہے تاکہ ہم اُس منزل کے قوانین تلے خود کو ڈھال سکیں۔ اس کا فیصلہ اگر دیانتداری سے ہم کر پائے، تو یہی ہماری صراطِ مستقیم ہوگی جس پر چل کر ہم اپنی آخری منزل (نظریۂ پاکستان کی تکمیل) تک پہنچنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ آج ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ قوم کے سامنے اسلامی دستور (نظریۂ پاکستان) بطور نصب العین رکھ دیا جائے اور اس پر اسی نہج سے رفتہ رفتہ عمل کر کے آخری منزل تک پہنچا جائے۔ یہ مسلک نظریۂ پاکستان سے مطابقت رکھتا ہے۔

یاد رکھئے، ایمان اور عمل صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض اور تمکّنِ دین ہے (24:55)۔

☆......☆......☆

خواجہ ازہر عباس، کراچی

اسلامی نظام کے قیام سے مقاصد عالیہ حاصل ہوتے ہیں

> اسلامی نظام کی اساس انسانی ذات کے یقین پر ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد جسم انسانی کے ساتھ ساتھ اس ذات کی نشوونما کرنا بھی ہے۔ ذات اپنے سارے ارادے اور مقاصد جسم کے ذریعے پورے کرتی ہے۔ اس لئے جسم کی پرورش بھی ضروری ہوتی ہے لیکن اصل مقصود بالذات، ذات کی نشوونما کرتا ہوتا ہے

میں آپ سے محوِ گفتگو ہوں اور بار بار میرے ہاتھ، میرے پاؤں، میری آنکھ، میری روح، میری جان ذکر کرتا ہوں۔ جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ میں اپنی ان چیزوں کو جس شے کی طرف نسبت دے رہا ہوں۔ وہ شے میرے جسم کے علاوہ کوئی اور شے ہے۔ مجھے اطلاع ملتی ہے کہ مجھے اپنے محکمہ میں ترقی مل گئی ہے جس سے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میرے ایک قریبی دوست کی وفات ہوگئی ہے تو مجھے اس سے بہت رنج ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات رنج، حسد، لالچ وغیرہ کی کیفیات لوگوں پر غالب آجاتی ہیں۔ اس میں سے کسی شے کا تعلق میرے جسم سے نہیں ہے۔ اپنی ترقی پر میں جب خوش ہوتا ہوں تو میرا ہاتھ، میرا پاؤں، میرا بازو، یہ خوشی محسوس نہیں کرتے بلکہ یہ ایک شے جو ہر وقت میرے ساتھ ہے، وہ یہ خوشی محسوس کرتی ہے۔ دوست کے انتقال پر جب رنج ہوتا ہے تو یہ رنج میرے سر یا پیر کو نہیں ہوتا، یہ رنج اسی شے کو ہوتا ہے جو میرے ساتھ ہے۔ قرآن کریم نے اس شے کو لفظ نفس سے تعبیر کیا ہے۔

ارشادِ عالی ہے:

وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِيۡنٍ‌ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ‌ۚ ثُمَّ سَوّٰٮهُ وَنَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ‌ وَجَعَلَ لَـكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـئِدَةَ‌ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ (32:7-9)، خدا نے انسانی تخلیق کے سلسلے کی ابتداء بے جان مادے سے کی۔ پھر اسے مختلف ارتقائی منازل سے گزارتے ہوئے اس مقام پر لے آیا جہاں اس کی نسل کی افزائش سلسلہ تولید سے ہونے لگی۔ اس مقام تک انسان اور حیوان میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ پھر اس نے اس سے حشو و زوائد الگ کر کے اس میں خاص اعتدال پیدا کیا اور اپنی توانائی کا ایک شمہ ڈال دیا اور اس طرح تمہیں سماعت، بصارت اور قلب عطا کر کے، اس قابل بنا دیا کہ تم مختلف علوم حاصل کر سکو۔ قَلِيۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ (32:9) لیکن تم میں سے بہت

تھوڑے ہیں جوان صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ یہ شے انسان کے سارے جسم میں ہوتی ہے۔کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ انسان کا نفس اس کے سر میں ہے۔ یا اس کے پاؤں میں ہے لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ہے لیکن ہر جگہ ہونے کے باوجود یہ تعین نہیں ہوسکتا کہ وہ جسم کے کس حصہ میں ہے۔بعض اوقات کسی حادثہ کی وجہ سے ایک شخص کی ٹانگیں اور بازو کٹ جاتے ہیں پھر بھی اس کا نفس اس کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔جسم کے کٹ جانے کی وجہ سے اس کی اس شے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جسم کم ہوجائے اور اس کا یہ نفس بڑھتا جائے۔ایک آدمی اگر حادثہ میں جسم کم ہونے کے بعد کوئی خطیر رقم اللہ کے دین کی مدد کے لئے دے دے، یا کسی فلاحی کام کے لئے دے دے تو اس کے نفس میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔جسم کے بڑھ جانے یا کم ہوجانے سے نفس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہاں تک کہ انسانی جسم کی موت آنے کے بعد بھی نفس انسانی زندہ رہتا ہے۔علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا؎

یہ نکتہ سیکھا میں نے بو الحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک عجیب چیز HELEN KELLER بھی تھی۔HELEN KELLER، نابینا، گراں گوش، اور گونگی تھیں۔ وہ نہ دیکھ سکتی تھیں، نہ سن سکتی تھیں اور نہ ہی بول سکتی تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔جسمانی صلاحیتوں کی کمی کے باوجود ان کے نفس میں کوئی کمی نہیں تھی۔

قرآنِ کریم نے عقل، شعور اور قلب سب الفاظ کو چھوڑ کر انسان کی اس زندگی کے لئے نفس کا لفظ استعمال کیا ہے۔اس نفس پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے جو فرد یا جو قوم اس نفس پر ایمان نہیں لاتی تو وہ انسانیت کے معیار پر ہی نہیں آتی جو فرد یا قوم اس نفس پر ایمان نہیں لاتی وہ حیوانیت کی سطح پر زندگی بسر کرتی ہے نہ اسے وحی کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی مستقل اقدار کی۔ اسے دین کی بھی کوئی ضرورت نہیں جو انسان کو حیوانی سطح سے بلند کر کے انسانی سطح پر لاتا ہے۔اس قوم کا تصورِ حیات ہی مادی ہوتا ہے۔قرآنِ کریم کا تصورِ حیات نفس انسانی کی پرورش پر استوار ہوتا ہے۔

اسلامی نظام کی اساس انسانی ذات کے یقین پر ہوتی ہے۔انسانی زندگی کا مقصد جسم انسانی کے ساتھ ساتھ اس ذات کی نشوونما کرنا بھی ہے۔ ذات اپنے سارے ارادے اور مقاصد جسم کے ذریعے پورے کرتی ہے۔اس لئے جسم کی پرورش بھی ضروری ہوتی ہے لیکن اصل مقصود بالذات، ذات کی نشوونما کرتا ہوتا ہے۔ ذات کی نشوونما مستقل اقدار پر عمل کرنے اور صفاتِ خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے سے ہوتی ہے۔مستقل اقدار پر عمل اور صفاتِ خداوندی کو اپنے میں پیدا کرنے کا عمل، صرف اسلامی نظام میں ہی ہوسکتا ہے۔غیر اسلامی نظام میں ان دونوں چیزوں پر عمل نہیں ہوسکتا۔اس لئے قرآن کی رُو سے اسلامی نظام قائم کرنا ضروری اور لازمی ہوتا ہے۔اسی لئے اُمتِ مسلمہ کا 14 سو سال سے اس بات پر اجماع رہا ہے کہ اسلامی نظام کا قائم کرنا ہر فرد پر واجب ہے اور جو شخص اسلامی نظام کے قیام کی فرضیت اور اس کے وجود سے انکار کرتا

ہے، وہ کافر، ظالم اور فاسق ہوتا ہے (5:47،5:45،5:44) اس تمہید کے بعد اب ہم اصل مضمون کی ابتداء کرتے ہیں۔

> جو قوم روحانیت کی قائل ہوگی وہ ہمیشہ زوال پذیر رہے گی کیونکہ روحانئین نے روح کو مادہ کے مقابلہ میں رکھا ہے۔ ان کے خیال میں مادی ترقی روح کی ترقی میں رکاوٹ بنتی ہے۔ ان کے خیال میں یا روح میں ترقی ہوسکتی ہے یا مادی کائنات میں

نزولِ قرآن کے وقت چاروں طرف روح انسانی کا تصور پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت سے لے کر اس موجودہ دور تک روح انسانی کا تصور ہی عام ہے۔ ہر جگہ ہر مذہب میں روحانیت کا دور دورہ ہے۔ روحِ انسانی ہی ہر مذہب کی بنیاد ہے۔ مغربی ممالک میں Progressive حلقوں میں بھی ''Spirituality'' پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ ہمارے مشرقی ممالک بھی تصوّف و یدانت اور روحانیت کو اہم مقام دیتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں روح کا لفظ بیس (20) مرتبہ آیا ہے۔ لیکن روحانیت کا لفظ ایک مرتبہ بھی نہیں آیا۔ روح کا لفظ 17 مقامات پر وحی، وحی لانے والا، وحی پانے والا کے معنوں میں آیا ہے۔ البتہ تین مقامات پر یہ لفظ نفخ روح کے معنی میں آیا ہے (15:25،38:72،32:9) کہ ہم نے انسان کو ایک صلاحیت عنایت فرمائی ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے زندگی The Life ہزاروں، لاکھوں سال میں آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی، جمادات، نباتات کی منازل طے کر کے حیوانیت کی سطح پر پہنچی۔ زندگی جب حیوانیت کی سطح سے بلند ہوئی اور اس کو اگلی منزل میں داخل ہونا پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف سے ایک توانائی عنایت فرمائی جس کو قرآنِ کریم نے روح کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ قرآنِ کریم کا اعجاز یہ ہے کہ جب تک یہ توانائی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے تو یہ روحِ خداوندی کہی جاتی ہے اور جب یہ توانائی نوعِ انسانی کو، بطور ایک نوع کے ملتی ہے تو قرآنِ کریم اس کو نفس کے لفظ سے تعبیر کرنے لگ جاتا ہے۔ توانائی تو یہ ایک ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جب یہ توانائی انسانیت کو بہ حیثیت ایک نوع کے ملتی ہے تو یہ نفس کے لفظ سے موسوم ہونے لگ جاتی ہے اور یہ توانائی ہی انسانیت کو حیوانیت سے ممتاز کرتی ہے۔ عام طور پر لوگ انسان کو ''جسم اور روح'' کا مرکب سمجھتے ہیں لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے انسان ''جسم اور نفس'' کا مرکب ہے۔ قرآنِ کریم روحِ خداوندی کا تو قائل ہے لیکن قرآن روحِ انسانی کا قائل نہیں ہے۔ اسی لئے قرآن نے روح کی تربیت کے کوئی اصول نہیں بتائے اور نہ ہی اس کے تزکیہ کا کہیں حکم دیا ہے۔ قرآنِ کریم نے جو روح اور نفس میں امتیاز کیا ہے یہ اس کا ایک بڑا اعجاز ہے۔ اس مضمون میں آگے چل کر آپ کو اس کا اندازہ ہوگا۔

قرآنِ کریم نے روح اور نفس میں جو امتیاز کیا ہے وہ اس کا اعجاز ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگ، تو یہ فرق سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ غضب یہ ہوا کہ مسلمانوں نے بھی اس فرق کو Detect نہیں کیا اور اس فرق کو نہ بھانپنا ہی ان کے زوال کا سبب بنا۔ چودہ سو سال اسی طرح گزر گئے لیکن ہمارے علماء نے اس فرق کو اہمیت ہی نہیں دی۔ تحریک طلوع اسلام وہ واحد تحریک ہے جس نے اس فرق کو محسوس کیا۔ جو قوم روحانیت کی قائل ہوگی وہ ہمیشہ زوال پذیر رہے گی کیونکہ روحانئین نے روح کو مادہ کے مقابلہ میں رکھا ہے۔ ان کے خیال میں مادی ترقی روح کی ترقی میں رکاوٹ بنتی ہے۔ ان کے خیال میں یا روح

میں ترقی ہوسکتی ہے یا مادی کائنات میں۔ پھر یہ روحانئین اس کائنات کے وجود کے ہی قائل نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کائنات کا تو کوئی وجود ہی نہیں ہے غالب کا صرف ایک شعر ہی ان کے تمام نظریات کو Sum-up کر دیتا ہے اس نے کہا:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

نیز کہا۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

اس پر مستزاد یہ کہ یہ حضرات حواس سے حاصل کردہ علم کو علم شمار ہی نہیں کرتے۔ یہ حضرات صرف اس علم کو علم تسلیم کرتے ہیں جو باطنی ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ قرآنِ کریم نے علم صرف اس کو گردانا ہے جو سماعت، بصارت اور فواد سے کام لینے کے بعد حاصل کیا گیا ہو (17:26) آپ خود غور فرمائیں جس قوم کے یہ نظریات ہوں وہ کس درجہ پست حالت میں جاسکتی ہے۔ روح کی ترقی پرستش کے ذریعے ہوتی ہے۔ نوافل، وظائف روح کی پرورش کے ذرائع ہیں۔ یہ رسومات پرستش ہر جگہ ادا کی جاسکتی ہیں۔ ان رسومات کے ادا کرنے میں کسی نظام کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے ذہن سے اسلامی نظام کا تصور ہی محو ہوگیا۔ اسلامی نظام مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اسلامی نظام اس لئے قائم کیا جاتا ہے کہ چونکہ اس نظام میں اللہ کے قوانین واحکامات جاری ہوتے ہیں اس لئے ان کی اطاعت سے نفس انسانی میں توسیع ہوتی ہے

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ (2:286)

خدا جو تم پر یہ حدود عائد کرتا ہے تو یہ اس لئے عائد کرتا ہے کہ اس سے تمہاری ذات میں وسعت پیدا ہوتی ہے

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ (2:286)

ذات کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ قانون مقرر فرمایا ہے کہ جو غلط عمل ہوتا ہے اس کا نقصان بھی اسے ہی بھگتنا پڑتا ہے اور جو درست عمل کرتا ہے اس کا فائدہ بھی اسے ہی ہوتا ہے۔

مذہب کی بنیاد روح پر ہوتی ہے اور روح کی پرورش پرستش سے ہوتی ہے۔ اس لئے مذہب زدہ لوگوں کو نہ تو اسلامی نظام کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ ہی پرستش کے ذریعے اطاعتِ خداوندی ہوتی ہے۔ یہ حضرات پرستش اور اطاعت کے درمیان فرق کو نہیں سمجھتے۔ پرستش ہر جگہ ہوسکتی ہے اسے کسی نظام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دین کی بنیاد نفس پر ہوتی ہے۔ نفس کی تربیت میں پرستش کا دخل نہیں ہوتا۔ نفس کی پرورش اطاعت خداوندی کے ذریعے ہوتی ہے اور اطاعت خداوندی صرف اسلامی نظام میں ہوسکتی ہے۔ جہاں اللہ کے قوانین نافذ ہوتے ہیں اس لئے اسلامی نظام قائم کرنا ضروری ہے کہ صرف اور صرف اس نظام میں رہ کر نفس کی نشوونما ہوسکتی ہے۔ چونکہ نفس کی پرورش کرنا زندگی کا مقصد ہے اس لئے اسلامی نظام کی

اہمیت کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ اسلامی نظام کی اطاعت ہی عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ جو حضرات یا جو تحریکات اس وقت بھی اقامت دین کے لئے اُٹھی ہیں وہ بھی روح اور روحانیت اور پرستش کے قائل ہیں تشیع میں اسلامی نظام کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہاں کے علماء نے ایران میں اسلامی حکومت قائم کردی تھی۔ مزید حیرت وتحیر اس بات پر ہوتی ہے کہ علماء ایران اسلامی حکومت قائم کرنے کے باوجود پرستش کے قائل بھی رہے اور پرستش کرتے بھی رہے۔ مصر میں اخوان المسلمون اور ہمارے ملک عزیز پاکستان میں جماعت اسلامی اور ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی تنظیم اسلامی دونوں اقامت دین کی داعی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ لوگ بھی پرستش کے قائل ہیں۔ مسلمان جب تک روحِ روحانیت اور پرستش کے قائل رہیں گے نہ اسلامی نظام قائم کرسکیں گے، نہ اطاعتِ خداوندی سے مالا مال ہوسکیں گے اور نہ ہی اس دنیا میں ترقی کرسکیں گے۔ مسلمانوں کو اپنے زوال کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی نظام قائم کریں اور اسلامی نظام کی اطاعت کو ہی عبادتِ خداوندی شمار کریں اگر آپ اسلامی نظام کی اطاعت کو عبادتِ خداوندی نہیں سمجھتے بلکہ اس نظام میں رہتے ہوئے بھی اس نظام کی اطاعت کو عبادت سمجھنے کے بجائے صرف پرستش کی رسومات کو عبادتِ خداوندی سمجھتے رہیں گے تو اس طرح اوّل تو یہ نظام قائم ہی نہیں ہوسکتا اور اگر قائم ہوگیا تو یہ جاری نہیں رہ سکے گا۔ اسلامی نظام کے قوانین کی اطاعت عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ جب آپ اسلامی نظام کے واجبات Revenues اور اس کے Taxes ادا کرتے ہیں تو اس کی ادائیگی خود عبادت خداوندی ہوتی ہے اسلامی نظام میں بجلی، سوئی گیس، ٹیلی فون، پانی کے بل ادا کرنا عبادتِ خداوندی ہوتی ہے اسلامی نظام کی عدالتوں کے فیصلے تسلیم کرنا اور ان کی اطاعت کرنا عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ اسلامی نظام کی ساری عدالتیں قرآنی عدالتیں ہوتی ہیں اس میں فرقہ وارانہ شریعتی عدالتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ مذہب کا تصور ہے۔ یہ عدالتیں وہ لوگ قائم کرتے ہیں جو مذہب کو دین بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآنی نظام کی ساری عدالتیں، تحصلیں، تھانے، سب مساجد اللہ ہوتے ہیں کیونکہ یہاں سے قوانین خداوندی جاری ہوتے ہیں۔ اس نظام کے سارے SYMBOLS شعائر اللہ ہوتے ہیں۔ اس نظام کا جھنڈا Flag، کرنسی، پاسپورٹ، ویزا، شعائر اللہ ہوتے ہیں۔ قرآنی نظام کے افسران حاملین عرش الٰہی کہلاتے ہیں (39:75)

ہمارے ہاں یہ نظریہ عام طور پر مروج ہے کہ ہندوستان میں اولیاء کرام نے اسلام کی بڑی تبلیغ کی اور لاکھوں ہندوؤں کو مسلمان بنالیا۔ اس سلسلہ میں اولیاء اللہ کی بڑی تعریف کی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ صوفیاء کرام اپنے دور کے بادشاہوں کو دین کا راستہ دکھا دیتے اور اُنہیں اقامت دین کے لئے مجبور کرتے، تو آج سارے کا سارا ہندوستان مسلمان ہوتا۔ اگر کہیں قرآنی نظام قائم ہوجاتا ہے تو دوسرے نظام اس نظام کے سامنے برف کی طرح پگھلنے لگتے ہیں۔

وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾ (110:2)۔

کیا تم نے دیکھا کہ لوگ اس دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔ خود فوج کے لفظ میں کثرت کا مفہوم مضمر ہوتا ہے

اوراس لفظ میں تیزی بھی شامل ہوتی ہے۔ پورے ہندوستان میں اگرایک جگہ بھی اس دور کا مسلمان بادشاہ دین قائم کردیتا۔تو آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ دوسرا ہوتا۔لیکن اس میں بادشاہوں کا قصور نہیں کیونکہ ان علماء نے اُنہیں دین کا راستہ ہی نہیں بتایا۔ دین کا تصور خود ان علماء کے سامنے نہیں تھا وہ خود سب روحانیت زدہ اور تصوّف کے قائل ہوتے تھے۔

اولیاء لفظ ولی کی جمع ہے اور ولی کے معنی دوست کے ہوتے ہیں ارشادِ عالی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّىۡ وَعَدُوَّكُمۡ اَوۡلِيَآءَ (60:1)

ترجمہ: اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ۔اس آیت میں مسلمانوں کے دشمن تو ظاہر ہے اسرائیل اور بھارت ہیں، مگر اللہ کا دشمن کون ہوسکتا ہے۔ظاہر ہے کہ اللہ کا دشمن وہ ہے جو اس کے دین کا دشمن ہے اور اس کی اقامت میں دشمنی کرتا ہے وہ اللہ کا دشمن ہے اسی مضمون کو سورہ انفال میں دہرایا گیا ہے ارشاد ہوا۔

وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَـيۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمۡ (8:60)

ترجمہ: اے ایمان والو اوران سے لڑائی کے واسطے قوت میں سے جو کچھ جمع کرسکو جمع کرلو اور پلے ہوئے گھوڑے تاکہ تم اس قوت سے اپنے اور اللہ کے دشمنوں پر دھاک بٹھا سکو۔ اس آیت میں بھی مسلمانوں کے دشمن تو واضح ہیں کہ وہ کفار ومشرکین ہیں لیکن اللہ کے دشمن وہ ہیں جو نظامِ خداوندی کے دشمن ہیں۔ان دونوں آیات سے واضح ہوگیا کہ جولوگ اللہ کے دین کے دشمن ہیں وہ اللہ کے دشمن ہیں۔ جولوگ اللہ کے دین کی مخالفت کرتے ہیں وہ اللہ کے دشمن ہیں۔تو جولوگ اللہ کے دوست ہیں وہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے دین کے دوست ہیں اور اللہ کا دین قائم کرتے ہیں۔قرآن کی نگاہ میں جو اقامتِ دین میں ایک رکاوٹ ہیں ان کی یہ عزت وتوقیر اوران کا یہ بلند مقام مذہب زدہ، اور مذہب خوردہ لوگ ہی کرسکتے ہیں۔ دین کے سامنے توان کی پرِکاہ عزت وتوقیر نہیں ہے۔

جس قدر عقلِ انسانی ترقی کررہی ہے۔ دنیا میں اسی قدر دہشت گردی، تشدد، فساد، خوف وہراس بڑھتا چلا جارہا ہے۔ پہلے ایک آدمی لاٹھی سے ایک آدمی کو مارسکتا تھا۔اب بم اور دوسرے ذرائع سے ایک آدمی آدھی دنیا کو تباہ کرسکتا ہے۔البتہ اگر عقلِ انسانی وحی پر مبنی نظام کو قائم کرے تو ساری دنیا میں امن وامان قائم ہوسکتا ہے۔آج انسان کو سب سے زیادہ امن کی تلاش ہے۔لیکن امن ناپید اور عنقا بن گیا ہے۔ اس کا واحد علاج قرآنی نظام ہے۔ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ نظام دنیا کو پوری انسانیت کے لیے امن کا گہوارہ بنا سکتا ہے ارشادِ باری ہے

فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ۝۳۸ (2:38)

ترجمہ: وہ عقل جو اس سے بیشتر جذبات کے پیچھے چل رہی تھی اب خدا کی طرف سے دی ہوئی راہنمائی کے پیچھے چلے گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خوف وہراس بھی نہیں رہے گا اور اس قوم پر حزن بھی نہیں رہے گا۔خوف خارج سے آنے والے خطرات سے ہوتا ہے اور حزن دل کے اندر پیدا ہونے والی بے چینی کو کہا جاتا ہے۔خوف کسی واقعہ کے وجود پذیر ہونے سے پیشتر ہوتا

ہے۔ حزن کسی MISHAP کے واقع ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ حزن خوف کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ سورہ نور میں اس سے ذرا زیادہ واضح طور پر اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ اس دنیا میں اقتدار حاصل ہونا ہوتا ہے۔ جو قوم بھی اللہ پر ایمان لائے گی اور اعمال صالحہ سرانجام دے گی، تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو اس دنیا میں اقتدار عطا کردے گا۔ اس قوم کو اقتدار ملنے کے بعد اس قوم میں بدامنی اور خوف کے بجائے امن وسکون پیدا ہوجائے گا وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ (24:55) ترجمہ: اور اللہ ان کے خوف کو امن میں تبدیل کردے گا۔ آپ غور فرمائیں کہ اس نظام کے قیام کے بعد امن جیسی نعمت مل جاتی ہے اور اس سے بڑی نعمت اور کون سی ہوسکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس چیز کا نتیجہ ہے۔ یہ اس نظام کے قائم ہونے کا نتیجہ ہے جو قرآن ہم کو عطا کرتا ہے۔

امن کے بعد دوسری اہم ترین چیز رزق اور رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ کوئی فرد ہو یا کوئی قوم ہو، قوانین خداوندی اور اللہ کے عطا کردہ نظام کی خوشگواریاں اور اس کے ثمرات تو ہر کسی کے لئے ہر دور انسانیت میں برابر ہوں گے۔ سورہ مائدہ میں ارشاد ہے

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ (5:66) فرمایا کہ اپنے اپنے وقت میں خدا کی جو صحیح تعلیم ان تک آتی رہی اور اگر یہ تورات وانجیل کا نظام قائم کرتے تو یہ اپنے اوپر سے اور اپنے نیچے سے رزق کھاتے۔ یعنی یہ کہ ان کے معاشرہ میں رزق کی خوب فراہمی ہوتی مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ (5:66) کی تشریح دوسرے مقام (7:96) میں ان الفاظ میں کردی کہ: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (7:96) تو ان پر سماوارض کی برکات کے دروازے کھل جاتے۔ یعنی اس نظام میں ارض کی برکات بھی ملتی ہیں اور سماء کی برکات بھی ملتی ہیں۔ یعنی یہ نظام انسان کی جسمانی زندگی کی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے اور اس کے علاوہ انسانیت کی جو ضروریات اور اس کے تقاضے ہیں ان کو بھی پورا کرتا ہے۔

تورات اور انجیل کے نظام کی طرح قرآنی نظام کی بھی یہی کیفیت ہے فرمایا:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6)

ترجمہ: زمین پر چلنے والا ایسا نہیں ہے کہ جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ آسمان پر روٹیاں پکوا کر پھینکوا دیتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے اس نے فرمایا یہ رزق کا سامان تو انسان کے پیدا ہونے سے پیشتر مہیا کردیا گیا تھا۔ سارا مسئلہ تقسیم رزق کا ہے جو نظام کے ذریعے ہوتا ہے۔ قرآنی نظام قائم ہی ان خطوط پر کیا جاتا ہے کہ جس میں ہر شخص کو رزق ملتا رہتا ہے اور کوئی شخص اس میں رزق سے محروم نہیں رہتا۔ حضرت عمرؓ نے یہی فرمایا تھا کہ اگر عمر کی مملکت میں فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرجائے تو عمر سے اس کی بازپرس ہوگی کیونکہ خدا نے دابہ کا لفظ استعمال کیا ہے جس

میں ہر چلنے والا شامل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر کسی بستی میں ایک شخص رات بھر بھوکا سویا، تو اس پوری بستی سے اس مملکت کی اطاعت مرفوع ہوجاتی ہے۔

قرآنِ کریم نے فرمایا کہ کوئی آئیڈلوجی تقسیم نہیں ہونی چاہئے۔ اس پر مجموعی طور اور کُلی طور پر عمل کیا جاتا ہے فرمایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱدْخُلُوا۟ فِى ٱلسِّلْمِ كَآفَّةً (2:208)

اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ ٱلْكِتَٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْىٌ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۖ (2:85) ترجمہ: کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لائے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو۔ سنو تم جو یہ کام کرتے ہو اس کی سزا کوئی نہیں سوائے دنیا میں رسوائی کے۔ قرآنِ کریم نے معاشیات کے جو اصول دیئے ہیں ساتھ ساتھ ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے تا کہ رزق کی صحیح تقسیم ہو سکے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ زمین تمام پیداوار کا بنیادی ذریعہ ہے اس لئے زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں ہے۔ ارشادِ عالی ہے وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَٰيِشَ (15:20)

ہم نے زمین کے اندر تمہارا رزق رکھا ہے۔ ہم نے اس سامان معیشت کو تمام نوع انسانی نے کے لئے رکھا ہے۔

مزید ارشاد ہوا

وَٱلْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ⑩ (55:10)

اس نے زمین لوگوں کے لئے بنائی۔ اس موضوع کے متعلق اس قدر آیات ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے لیکن ایک عقلی دلیل ہے کہ زمین پہلے وجود میں آئی، اور انسان اس کے بہت عرصہ بعد پیدا ہوا ہے۔ انسان سے پیشتر یہ کس کی ملکیت تھی۔ جو لوگ طاقت اور قوۃ رکھتے ہیں انہوں نے اپنی طاقت کے مطابق زمین پر قبضہ کر لیا اس سے ان کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی۔

سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے (2:119) اور تجھ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں۔ کہہ دے جو اپنی ضروریات سے بچے۔ اس ایک لفظ میں اسلام کا سارا معاشی نظام آجاتا ہے۔ جس پر اب کتابیں تحریر کی جارہی ہیں۔ اسلام کا معاشی نظام ایک طویل مضمون ہے جس پر بہت تحریر کیا جاچکا ہے۔ یہ مضمون طویل بھی ہوگیا اور اس کے موضوع میں یہ نہیں ہے۔ لیکن اس موضوع پر الگ مضمون پیش کر دیا جائے گا۔

❀❀❀

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورۃ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورۃ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصٰفٰت، صٓ، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۃ الفتح، الحجرات، قٓ، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۃ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربٰو (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی وملائی وپیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردمومن	مقام محمدی ﷺ	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

تم بہت بہادر ہو

ارشد صاحب ایک سکول میں پڑھاتے تھے۔ وہ سچ مچ ایک استاد تھے۔ بہت سے پڑھانے والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ بس کلاس میں سبق دے دیا اور پھر لڑکوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ارشد صاحب ایسے نہ تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اچھی طرح سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ ظفر کو تقریر کرنے کا شوق تھا، ارشد صاحب نے اس کی ہمت بڑھائی اور اسے بتایا کہ تقریر کیسے کی جاتی ہے۔ مزمل کو تصویریں بنانے سے دلچسپی تھی، ارشد صاحب اس کے لیے تصویریں بنانے کی کئی کتابیں لائے۔ سلیم کو شعر یاد کرنے کا شوق تھا، ارشد صاحب نے ایک کاپی پر اسے بہت اچھے اچھے شعر لکھ کر دیے۔ ایسے شعر جن سے آدمی کو اچھے اچھے سبق حاصل ہوں۔

تم تو جانتے ہی ہو کہ ہر سکول میں اچھے لڑکے بھی ہوتے ہیں اور بُرے لڑکے بھی۔ بہت سے استاد بُرے لڑکوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہمیشہ ان کی بُرائی کرتے تھے۔ مگر ارشد صاحب ایسے لڑکوں سے بھی پیار کرتے تھے۔ وہ کسی سے نفرت کرنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ اپنے ساتھیوں سے وہ اکثر کہتے تھے کہ تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ بُروں کو اچھا بنایا جائے۔ یہ کام بڑی محنت چاہتا ہے اور مدتوں بعد اس محنت کا پھل ملتا ہے۔

چھٹی جماعت میں ایک لڑکا تھا۔ اس کا نام فیروز تھا۔ وہ ہمیشہ سب سے بدتمیزی کرتا۔ نرمی سے بات کرنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ ایک دن اپنی کلاس کے کسی لڑکے سے سڑک پر اس کی لڑائی ہوگئی۔ فیروز کہنے لگا:

’’تم احمق ہو۔ جاہل ہو۔ تمہارے گھر والے بھی ایسے ہی ہیں۔‘‘

اتفاق سے یہ باتیں ارشد صاحب نے بھی سن لیں۔ دوسرے دن جب وہ چھٹی جماعت میں پڑھانے آئے تو سبق شروع کرنے سے پہلے انہوں نے لڑکوں سے کہا:

’’کل تمہارے ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو جاہل اور احمق کہا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے گھر والوں کو بھی بُرا بھلا کہا۔ تم سب ایک دوسرے کے بھائی ہو اگر تم دوسروں کی بے عزتی کرتے ہو تو اپنی ہی بے عزتی کرتے ہو۔‘‘

’’تعلیم اور شرافت کی ایک پہچان آدمی کی بات چیت ہوتی ہے۔ ادھر تم نے زبان کھولی اور ادھر پتہ چل گیا کہ تم کیسے انسان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن شریف میں ہمیں حکم دیا ہے کہ ہمیشہ ایسی زبان بولو جو شریفوں کی زبان مانی جاتی ہو۔‘‘

’’قرآن شریف نے ہمیں گفتگو اور بول چال کے بارے میں اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں۔ ہمیشہ صاف، سچی اور سیدھی بات کرو، جھوٹی باتوں سے ہمیشہ بچو۔ ہمیشہ اچھی اچھی باتیں کرو۔ جب بھی بات کرو انصاف کی بات کرو۔‘‘

اور ہاں! بعض بچے اونچی آواز میں چیخ چیخ کر، چلا چلا کر باتیں کرتے ہیں۔ اس طریقہ کو آج پوری دنیا میں کہیں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ گنوار اور جاہل لوگ چیخ کر باتیں کرتے ہیں۔ بہت پہلے قرآن شریف نے انسانوں کو بتایا تھا کہ اپنی آواز کو نیچا رکھو۔ سب سے بُری آواز گدھے کی ہوتی ہے۔‘‘

’’اچھا میرے بیٹو! یہ تو ہوگئیں کچھ کام کی باتیں۔ اب اپنا سبق شروع کرو۔‘‘

ارشد صاحب نے مسکرا کر پڑھانا شروع ہی کیا تھا کہ فیروز اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے کہا:

’’جناب! مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔‘‘

ارشد صاحب نے مسکرا کر کہا: ’’ضرور ضرور۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔‘‘

فیروز نے کہا: ’’جناب! آپ نے آج جو کچھ کہا ہے میرے دل میں ایک ایک بات اتر گئی ہے۔ آپ نے مجھے شرمندگی سے بچانے کے لیے میرا نام نہیں لیا۔ کل میں نے ہی ارشاد کو برا بھلا کہا تھا۔ میں اپنے بھائی ارشاد سے آپ سب کے سامنے معافی مانگتا ہوں۔ انشاء اللہ اب میری کسی بات سے میرے کسی بھائی کو دکھ نہ پہنچے گا۔‘‘

یہ کہتے ہوئے فیروز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ارشد صاحب نے آگے بڑھ کر فیروز کو گلے سے لگالیا اور اس سے کہا: ’’فیروز! تم بہت بہادر ہو۔۔۔ اپنی غلطی مان لینا سب سے بڑی بہادری ہے۔‘‘

❁❁❁

کوئی دعویٰ نہیں

کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآن کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں، تو اس بات کو نہ کوئی سند حاصل ہوسکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہوں، خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہوگیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں، اور منسوب کردیتے ہیں انہیں تحریکِ طلوع اسلام کی طرف، وہ دانستہ ایسا کرتے ہوں یا نادانستہ، دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کے لیے سند صرف وہ تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔

(پرویزؒ، سالانہ کنونشن، 17 تا 20 مارچ 1966ء)

The Human Self and Allah

Episode No. 9

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

3.5.2 Rejection of the Belief of Trinity

And secondly, the Christian belief of Trinity that Father, Son, Holy Spirit are threeinone and oneinthree gods,is refuted:

O People of the Book! Commit no excesses in your Deen: nor say of Allah aught but the truth. Jesus the son of Mary was (no more than) a messenger of Allah, and His Word, which He bestowed on Mary, and a Spirit proceeding from Him; so, have Eimaan in Allah and His messengers. Say not 'Trinity': desist, it will be better for you, for Allah is One Ilaah: glory be to Him, (far exalted is He) above having a son. To Him belong all things in the heavens and on earth. And enough is Allah as a Disposer of affairs. (4:171)

In another verse it is stated:

Surely, they do Kufr who say Allah is one of three in a Trinity. For there is no Ilaah except one Ilaah. If they desist not from their word, verily a grievous penalty will befall the deniers among them. (5:73)

3.5.3 Gods and Goddesses

One form of *Shirk* is that others be declared as partners in the Divine Self i.e. more than one god should be accepted.Anotherform isthat other powers should be considered as sharing in His tasks, commands and Will. According to the belief system of Hindus, Brahma is the one who creates, Vishnu is the one who sustains, and Shiv is the one who confers death. Aside from these, there are hundreds of goddesses and gods who are regulators ofthe various departments of fate and destiny. But the Quran

declares that:

…They have no protector, other than Him; nor does He share His command with anyone whatsoever. (18:26)

When none can share in His command and Will, then how can he become a disposer of affairs:

Say: 'Shall I take for my protector any other than Allah, the Maker of the heavens and the earth? And He it is that feeds but is not fed'. Say: 'Nay! but I am commanded to be the first of those who bow to Allah (in Islam), and be not you of the company of those who join gods with Allah'. (6:14)

3.5.4 Worship of the Messengers

After gods and goddesses, manmade the messengers of Allah into gods and no followers of any religion in the worldescaped from this. So much so,that the condition of the followers of Buddhism and Jainism, in whose teachings there is noteven the conceptof a god,also became such that worship of Buddha and Mahavir was instigated a short time after their deaths. Confucius had condemned the worship of gods but worship of Confucius himself began to then take place in the temples of China. The other religion of the people of China is Taoism whose founder was Lao-Tze. He also did not teach worship of idols, but despite this worship of his statue is also taking placefor the last two thousand years.[1] In Japan, along with the statues of Buddha, the manifestations of their 'god' i.e. the sword and the mirror are also worshipped, which according to their ancient religion of Shinto the goddess of the Sun had placed into the keeping of her grandson i.e. the first King of kings of Japan.

---

[1] Socialism is now becoming normal in China according to which no *Eimaan* remains in any type of god. Therefore, for them worship of 'gods' has either become tales of the distant past or will only exist among those conservative fundamentalists who will not have been affected by the atheistic beliefs of socialism. Such people will, however, be rare there.

5.5 Statues of the Founders of Religion

In Christianity, along with the divinity of Christ, statues of Jesus and Mary are worshipped. The belief of avatar among the Hindus is also a reflection of this worship of messengers. Or, as has been noted earlier, worship of the messenger by the Christians is areplica of the avatar belief of Hindus. The Quranhas closed the door toworship of the messengers so firmly that no reverent belief of the human mind can open it.[1] Only one verse is quoted here in this regard:

> It is not (possible) that a man, to whom is given the Book, and wisdom, and messenger-hood, should say to people: 'Be you my followers rather than Allah's'. On the contrary (he would say): 'Be you followers of Him Who is truly the Sustainer of all; for you have taught the Book and you have studied it earnestly'. (3:79)

In other words,those people who have begun the worshipping of the messengers,this is their own invented path. No messenger of Allah directed them to do this. The messengers of Allah used to come to teach obedience of Allah, not to have themselves worshipped. But what is the curefor the human mind that did notdesist from making Allah's messengers as god!

3.5.6 Worship of the Religious Clergy

After the messengers, the turn comes of the religious scholars and saints i.e. the religious clergy, who are initiallyconsidered to bethemeans of reaching God, and subsequently are themselves made into gods. The Magi of Magians, the Brahman of Hindus, the Lama of Buddhists, the priest of Christians -worship of all of these takes place. The Quran locked these windows as well, stating:

> Yet there are men who take (for obedience) others besides Allah.As equal (with Allah) they love them as they should love Allah, but those with Eimaan

---

[1] Details of this aspect will be available in my book *Iblees O Adam*.

are overflowing in their love[1] for Allah. If only the unrighteous could see, behold, they would see the punishment: that to Allah belongs all power, and Allah will strongly enforce the punishment.[2] (2:165)

3.5.7 Invitation to the People of the Book[3] to *Tauheed*[4]

In relation to this aspect of *Shirk*, the Quran has also invited the people of the Book to *Tauheed*, stating:

> Say: 'O People of the Book! come to common terms as between us and you: that we follow none but Allah; that we associate no partners with Him; that we erect not, from among ourselves, lords and patrons other than Allah'. If then they turn back, say you: 'Bear witness that we (at least) are Muslims (bowing to Allah's Will)'. (3:64)

3.6 Beliefs of Materialism

This is the devising of god out of tangible things, but the Quran does not treat the symptoms of disease, instead it addresses the root cause of the disease. Its sight is directed on the finest of finest non-tangible causes and effects on the foundation of which the structure of tangibles arises. We see clearly that the system of nature works on the principle of cause and effect. Effects are established as a result of the accumulation of causes. Man, accustomed to physical forms,considers these effectsasexisting in themselves, in other words he thinks that these characteristics are intrinsic within these things. This is that idea which is the basis of materialism. An individualobserves that the one who consumes arsenic dies after a short interval. He thinks that this property is intrinsically present within arsenic that it is life severing. He sees that if seeds are sownafter making the land level and soft,and if it is watered at suitable times, then crops will sprout from it. He thinks that these potentials are intrinsically present within these

[1] 'Love' as referred to here means to follow Allah's laws as revealed in the Quran. (Ed)

[2] This is the consequence, based on the Law of Requital, of going against the Divine laws. (Ed)

[3] Those who are known to have received Allah's revelation i.e. Christians and Jews. (Ed)

[4] *Tauheed* – oneness of Allah, sometimes translated as monotheism. In practical terms it means following the Permanent Values of the Quran. (Ed)

things, and when outcomes are what are known as the accumulation of these causes, then no need remains for an 'external' power.

Man, in his infancy, used to consider those things from which benefits were accrued as being worthy of respect, and used to be frightened of those things from which loss was incurred. Therefore, he used to prostrate before them. By worshipping them, he wished to keep them happy.The cow, the Ganges, the tulsi plant, the poplar tree; or on the other hand, snake, thunder, earthquake, all were declared as being worthy of worship under the influence of these very sentiments. When man progressed a little further, though he gave up worship of these things, he now began the worship of those human beings through whose hands these things were being received. Having abandoned the worship of the tulsi plant itself, he began worshipping the Jogi who was handing out thesesame leaves from his lap. Whether this worship is of the leaves or of the one who hands out the leaves, it happened according to the same sentiment i.e. it was thought that these properties - that they can result in profit or cause harm -are intrinsically present in these things or people. Though this era of worship no longer remainstoday, the sentiment due to which this worship used to take place still endures. Even now, when he recovers from a disease, although he does not thank the bottle of medicine which became themeans for his recovery, he certainly considers the doctor who prescribed the medicineas the bestower of healing. This is the second stage of human intellect. When this same intellect achieves maturity, then at thatstage,in the same way that men of today consider thanking the bottle of medicine itself as being contrary to intellect, he will also stop thinking that a man like himselfhas the power to providehealing. At that time his eyes will accept this truth that in the universe the effect of every deed is manifested according to the established laws of Allah. By operating according to this law, we gain health and strength, and by disobeying it disease and ultimately death occurs. The status of experts on different subjects is no more than this, that they possess knowledge of the Divine laws. They absolutely do not possess the authority or control to change these laws or to establish effects contrary to these laws. This is that truth which the Quran has noted as follows (viathe lips of Abraham):

'Who created me, and it is He Who guides me; Who gives me food and drink. And when I am illit is He Who cures me; Who will cause me to die and then to live (again)'. (26:78-81)

In other words every event manifests itselfhere according to the law of Allah.

3.7 Human Jurisdiction

And then not only is it that the Quran defines this concept merely about 'things' and not about human beings, considering things to have intrinsic effectiveness is definitely ignorance, but not as dangerous as considering human beings to beabsolute sovereigns. The reason for tyranny and cruelty in the world and oppression is because this thing has been imprinted in the minds of subjugated human beings that powerful human beings are masters and owners of all powers. They can confer sustenance and can also snatch it away; they can kill and can grant life also. It is according to these beliefs that human beings who are masters of power and authority force others to become their slaves, and these are those same *Arbab-un-min-doon-Allah* (gods other than Allah) whose 'worship' has been done in every era till now. The Quran teaches *Tauheed* in this matter as well –it declares that the Master of all powers is solely the law of Allah, therefore no human being has thisright that he should impose his rule on other human beings. Yusuf(Joseph) says to his companions in the prison:

'O my two companions of the prison! (I ask you) Are many lords differing among themselves better, or Allah, the One, Supreme and Irresistible? If not Him, you follow nothing but names[1] which you have named - you and your fathers - for which Allah has sent down no authority; the command is for none but Allah: He has commanded that you follow none but Him: that is the right Deen, but most men understand not.' (12:39-40)

---

[1] The Quran has pointed to a great truth here where human beings give a certain name or title to something and suddenly it assumes some great significance e.g. a name given to a stone such as a diamond, and suddenly it becomes very precious. Another example is where an ordinary human being is termed as His Royal Highness – yet he is only a mortal like any other man in the street. (Ed)

3.7.1 Fear Disappears Due to*Eimaan*

Just imagine that if *Eimaan* in this type of *Tauheed*becomes established in the heart of man, then does any power remain in the world from which man will be fearful? If he is ever fearful,it will be due to going against the Divine laws, apart from this he will not be fearful of anyone.This is the reason that the Quran has stated the attribute of *Momineen* as being:

...there is no fear, nor shall they grieve. (10:62)

3.8 *Samdeat*

The second verse of Surah *Ikhlas*whose first verse has been noted in Section 3.5, is:

AllahAs-Samad. (112:2)

The word *Samad-un* has appeared in the Quran only once, but this word contains within it sucha comprehensive meaningthat itsexplanation can be challenging. It is commonly translated as 'Allah is least concerned' and the meaning taken from this is that he is very disinterested. From this 'disinterestedness' the mind immediately thinks of asovereign, autocrat, king (dictator) who does not care about any rule or law and carries on doing whatever comes to his mind, regardless of whateverthe consequences may be, and that in this same way(Allah forbid) Allah does not care. There is no doubt in this that He is the Supreme Being and Ruler of all rulers and is Sovereign Himself, but this is not the meaning of His being 'unconcerned'. The meanings of *Samad*are such a One Who is not dependent on anyone else for any of His affairs; such a leader towards whom one should turn in difficulties and during campaigns; such a high and mighty rock that, when the spectre of floodwater encircles all around, then He is the only source of protection and rescue for the aid of man. From *Samdeat*the meaningis that Allah is not reliant on anyone in any of His matters.This is the fundamental attribute of a developed personalitythat it does not owe its being, survival

and strength on external supports. It remains alive and established due to its own inner strength. And since the Self of Allah is the most complete Being, in His case one cannot therefore even imagine the need for any external support.[1] Contrary to this, every other thing which wishes to existis in need of His support for its existence. This is the meaning of *Allah As-Samad*.

3.9 Belief in Progeny of God[2]

The third verse of Surah *Ikhlas* states:

He begets not, nor is He begotten. (112:3)

The belief in progeny of God is a very old one. As has been written earlier, because man used to base the god created by his own mind on his own form, that is why he wouldcombineall the human characteristicsin this god. For man, children arethe greatest of blessings and a big support, therefore why would he keep his 'god' deprived of this? And in any case, when he observed that the process of reproduction is only operational through conception and birth, then it could not enter his mind that any being, even if it is God, can be free from this. According toZoroastrians their most ancient god *Mithra*is regarded as the son of the god *Ahura Mazda*. This same belief, according to Clement Wood and Dr. Brown, having reached Rome, became the belief of Christ as being the son of God. Among Hindus, over and above progeny, gods were also considered to have wives. The wife of *Sheva* is *Parvati* and their son is *Ganesh*.The daughter of Brahma, who is the highest of all gods, is called *Sarswati*. In Ragved Mandal No. 1, Sowkat No. 22, Mantra No. 12 it is stated:
'In this task, I call upon Indra's wife and Waran's wife Agni, to drink sowm, and for my well-being'.

3.9.1 Origin of the Creation of the Universe According to Hinduism

In ancient Hindu religion,the system of the birth of creation is thesame one

---

[1] This is the reason that the Quran repeatedly emphasises to create a self based on *Eimaan* and righteous deeds so that it is not influenced by the outer human world in anyway. (Ed)

[2] The word 'God' has been used here as this is a non-Quranic belief, and not related to Allah. (Ed)

that could be conceived during the era of infancy of the human mind. We present one example here with apologies to the refined feelings of our readers, from *Shatpath Brahmin*and also*Brahdar Neik Upnashid*, according to which:

'Parmeshwar could not copulate due to the fact of being alone. Therefore, he desired a wife for himself and grew as big as a man and woman are when copulating. Then this Ishwar cut himself up in two parts and became a wife from one half and a man from the other. Then the wife hid, and kept changing into a cow, a mare, a she-donkey, anewe etc. And Parmeshwar kept changing intoa bull, a horse, a donkey and a ram etc. From this mating cows, horses, donkeys, single-hoofed animals, sheep etc. were produced.'

The need to quote these things is only to illustrate this point, how along with establishing the correct concept of Allah,the Quran also continues to contradictall the wrong and false beliefs in the world. He did not produce anyone through copulation –not only does this contradictChrist and *Uzair*as being sons (of God), but it also contradicts every one of those beliefs according to which the beginning of the birth of creation is accepted to be via the process of fathering and reproduction from God. All of the aspects of the Quran cannot become clearly evident until the different beliefs of the different religions of the universe are not in front of us. The pattern of the Quran is this, that after contradicting all wrong beliefs, it etches the correct concept in the mind. In order to demonstrate these wrong beliefswe occasionally have to quote those excerpts which may be unpleasant to our aesthetic sense.

3.9.2 Procreation and Creation

Although the meanings of both procreation and creation are to create, as far as the concept of the self is concerned, there is a difference of heaven and earth between them. In procreation (i.e. birth through copulation), a part of the creator transfers and becomes part of the one being created. This matter is against the concept of the self (personality). The self is an indivisible entity, no part of which can be separated from it, neither can any

part of one self become the cause for the creation of another self. Therefore, in relation to the self, the very concept of procreation is false. Contrary to this, in creation no part of the creator separates from him, nor does that part become part of the creation. Therefore, from the aspect of the self an act of creation will take place, not an act of procreation. Procreation is a trait of the animalistic level of life. Creation is an attribute of the self – at a fundamental levelof the Divine Self, and following from that, of the human self.

Therefore, those religions which have associatedthe process of procreation with God, are clueless about this fundamental concept of the self. You can see how all these superstitions are contradicted from all sorts of directions and aspectsin the Quran.The Quran states:

They say: 'Allah has begotten a son': Glory be to Him – Nay, to Him belongs all that is in the heavens and on earth; everything follows His commands. To Him is due the primal origin of the heavens and the earth: When he decrees a matter, He says to it: 'Be, and it is'. (2:116-117)

3.9.3 Creator of Everything

This means that He brought this system of the universe into existence from nothingin such a way that whatever thing He initiated an intention about, it came into existence. How pure and pristine this concept is,and to what an extent He,the True Allah, is master of powers! The Quran states:

He to Whom belongs the dominion of the heavens and the earth: no son has He begotten, nor has He a partner in His dominion: it is He Who created all things, and ordered them in due proportions. (25:2)

In Surah *Maryam*:

It is not befitting to (the majesty of) Allah that He should beget a son. Glory be to Him! When He determines a matter, He only says to it, 'Be, and it is'. (19:35)See also (4:171, 10:68-69, 23:91)

The belief of the progeny of Allah is so wrong and baseless that no-one can provide any evidence for it. This is the reason that today the followers of those religions among whom this belief is prevalent produce such strange and bizarreinterpretations and make efforts that it should be understood that these things are merely metaphorical – it does not mean real progeny.

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان وکائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.75
ISSUE
08

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam

طلوعِ اسلام اور علامہ پرویز علیہ الرحمہ کے نام پر چندوں کی اپیلیں

ادارہ طلوعِ اسلام کا موقف:

ادارہ طلوعِ اسلام اور علامہ غلام احمد پرویزؒ کے فکر قرآنی کے نام پر چندے اکھٹے کرنے کی مہم علم میں آئی ہے جس پر ادارہ طلوعِ اسلام کی جانب سے وضاحت ضروری ہے۔ علامہ غلام احمد پرویزؒ نے اپنی زندگی اور اپنے تمام وسائل قرآن حکیم کی ترویج واشاعت کیلئے وقف کئے تھے لیکن زندگی بھر کسی سے چندہ یا مالی مدد قبول نہیں کی۔ ادارہ طلوعِ اسلام علامہ پرویز صاحب کی نگرانی میں وضع کردہ اصولوں پر آج تک کاربند ہے اور پاکستان کے اندر یا بیرون ملک کسی بھی چندہ مہم یا مالی امداد کے حصول کیلئے کوشاں کسی بھی سیاسی / فلاحی تنظیم سے طلوعِ اسلام کا کوئی تعلق نہیں۔

لہٰذا تمام قارئین اور طلوعِ اسلام کے وابستگان سے درخواست ہے کہ ایسی کسی بھی چندہ مہم کی حوصلہ شکنی کے ساتھ ساتھ ادارہ کو بروقت مطلع فرمائیں تاکہ کسی بھی فرد یا تنظیم کو طلوعِ اسلام یا علامہ غلام احمد پرویزؒ کے نام پر چندہ اکھٹے کرنے سے روکا جاسکے۔

منجانب

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام

25 بی گلبرگ 2 لاہور پاکستان